فہرست مضامین

تزئین اردو حصہ اول

اس کتاب میں نہایت ستھرے اور پاکیزہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف زبان درست ہوگی اور ادب کا ذوق ترقی کریگا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی بچوں میں اعلیٰ درجہ کے خیالات پیدا ہونگے۔ اور ان میں یہہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ خود بھی ایسے ہی پاکیزہ مسائل پر غور وخوض کرکے کام کی باتیں پیدا کریں۔ اس کتاب کے مضامین بھی ایسے لوگوں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں جو اردو زبان کے بہترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں فقط

خاکسار

مؤلف

د

نقل مراسلہ صدر دفتر نظامت تعلیمات ممالک سرکار عالی واقع ۹ آذر ۱۳۴۵ف

مجاریہ نشان (۶۲) ش ۱۸۳/۲۷ ۱۳۴۴ف

مہر

بنام سیکشن ۲ اسلامیہ ۷۲۵ بیچ صفدر ۳/۷۵ غفرالعام

بجناب فضل محمد خاں ایم اے ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی

بخدمت مولوی سید مرغوب الحسن صاحب نقوی دکن

حیدرآبادی ساکن محلہ اعظم پورہ جدید مکان ۱۳۰ بلدۂ حیدرآباد

مقدمہ

تزئین اردو حصہ اول و دوم

منتخب ادبی مضامین حصہ ۲

بجواب درخواست مورخہ ۲۲ مہر ۱۳۴۴ف ترقیم ہے کہ آپ کی پیش کردہ کتب تزئین اردو حصہ اول و دوم و منتخب ادبی مضامین حصہ اول و دوم" کو صدر مجلس انتخاب کتب منعقدہ ۴۴ف نے جملہ مدارس کے کتب خانہ جات اور انعام کیلئے موزوں قرار دیا ہے فقط

شرح دستخط

(جناب مولوی) شیر محمد خاں (صاحب)

مددگار ناظم تعلیمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماضی و حال

(از)

ہز اکسلنسی راجہ راجایاں سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر
یمین السلطنت جی سی آئی ای صدر اعظم باب حکومت

دنیا کی جب سے ابتدا ہوئی ہے اُس وقت سے ہر نسل کو اس امر پر غور کرنے کا موقع ملتا رہا ہے کہ آیا تہذیب تمدن میں ترقی ہو رہی ہے یا نہیں اس لحاظ سے ہم میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دنیا کی گذشتہ و موجودہ حالت پر اکثر بحث و مباحثہ کیا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب تک ایسی باتوں پر غور نہ کیا جائے ترقی کا دروازہ بند رہتا ہے۔ یہہ اظہر من الشمس ہے کہ دنیا کی ترقی محض انسان اور انسان کی عقل و تدبیر کی منت کش ہے۔ انسان کے سوا سے دوسری مخلوقات یعنی جمادات و نباتات وغیرہ

ہیں وہ خصوصیات نہیں ہیں، جو کائنات کے
سنوارنے میں ممد و معاون ہوں۔ اصل میں یہ
مخلوقات انسانی عقل و حکمت و دانش و تدبیر کی
مانع ہیں گویا قدرت میں ان کا ظہور صرف اس
غرض سے ہوا ہے کہ انسان کو اس کی ضروریات
و آرام و آسائش میں مدد دیں۔ اس میں شبہ
نہیں کہ فاطر السموات والارض نے جہاں اسقدر
مختلف النوع مخلوق پیدا کی ہے وہاں حضرت
انسان کو یہ صلاحیت و فہم و بینش عطا کی ہے
کہ گیتی کی آرائش میں روزبروز سعی و کوشش
کرے۔ اسی نظریہ کے ماتحت ہم چاہتے ہیں
کہ اپنی پیش روں نسلوں اور موجودہ لوگوں کے
حالت میں جو مشابہت یا فرق ہے اس کو ایسا
واضح کردیں کہ لوگوں کو عام طور پر غور و فکر
اور عمل صالح کی جانب رجحان پیدا ہو۔
دنیا کے مورخوں کا یہ ایک مشہور مسئلہ ہے
کہ آج ۔ کل کا آئینہ دار ہے یعنی آج کی حالت

کا اندازہ کل کی حالت سے کیا جاتا ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہہ ہے کہ ہماری آج کی کیفیت کل کی حالت سے بہتر ہے ، برابر ہے یا بدتر اس بحث کو ہم صرف ہندوستان تک محدود رکھیں گے ہندوستان کی تاریخ نے اب تک بڑے بڑے تین دَور دیکھے ہیں۔ پہلے دور میں ہندوؤں کا راج رہا۔ دوسرے میں مسلمانوں کی بادشاہی رہی تیسرے یعنی موجودہ دور میں انگریز براج رہے ہیں جس زمانے میں ہندوؤں کا راج عروج پر تھا اس وقت کے باشندوں کے مختلف طبقوں پر نظر ڈالیے تو ہندوؤں کا عہد یادگار عہد ہے بکرماجیت کی عظمت سے تاریخ داں ناآشنا نہیں ہیں۔ گوتم بُدھ کی روحانیت نے تو پچھلے زمانے کے خیالات کی رو کو یک سر پلٹ دیا چاند سورج ، سانپ ، بچھو ، شجر حجر کی پرستش کو یک سر مٹا دیا اور رفتہ رفتہ لوگوں کو خدانیت سے قریب تر کرنے لگی۔

تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ راز آفرنیش کے انکشاف کے لئے کیسے کیسے اولوالعزم اشخاص نے غور و محنت کی۔ ہندو فلسفے کے چھ مدرسے قائم ہوئے۔ جن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی۔ اور آج تک یہی چھ مدرسے ہندو فلسفے کی بنیادیں تصور کئے جاتے ہیں اور انہیں پر ہندو تصوف کی ترقی کا مدار ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں سوائے اہل ہنود کے کوئی نہ تھا سکندر اعظم نے بے شبہ ہندوستان پر حملہ کیا تھا لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور نہ اس نے کوئی مستقل اثر چھوڑا۔ اب غور کی جگہ ہے کہ جب ہندوہی ہندو تھے۔ جن میں بڑے بڑے رشی فلسفی۔ پنڈت۔ عالم۔ فاضل تھے تو ان کی تہذیب میں کیا کمزوری واقع ہوئی کہ وہ آگے نہ بڑھ سکی اور جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی اور اغیار کو ملک ہند پر تسلط کا موقع مل گیا۔

ہمارے نزدیک ان کی تہ میں کوئی نہ کوئی
بات ایسی مضمر ہے کہ جو اس تہذیب پر
غالب آگئی۔ آپ بیتاب ہونگے کہ آخر یہہ
کونسی بات مضمر تھی۔ واقعہ یہہ ہے کہ کسی
قوم یا کسی ملک میں علم وعمل اور عقل وحکمت
کی جب تک آفرینش مسلسل ہوتی رہتی ہے
اس وقت تک اس کو زوال نہیں آسکتا۔
لیکن جب ذرا بھی غفلت کے ہلکے پردے پڑنے
شروع ہوتے ہیں تو ان کو اگر ابتداء ہی میں
چاک نہ کردیا جائے تو استحکام باقی نہیں رہتا
اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں میں بڑے
بڑے اچھے۔ نیک۔ رحمدل۔ بہادر اور عالم
راجگان و امراء موجود تھے لیکن ان میں کسی
قسم کا مضبوط رشتہ اتحاد کا قائم نہیں تھا۔ ایک
دوسرے سے چشمک رہتی تھی اور ذرا ذرا سی بات
پر بعض اوقات عرب کے جاہل قبیلوں کی طرح
یہہ راجگان بھی کشت وخون پر اُتر آتے تھے۔

کوروں اور پانڈوں کی جنگ سے کون واقف نہیں۔ راجپوتانہ کی خانہ جنگیوں کا حال کس کو معلوم نہیں۔ کبھی بھی ان لوگوں نے اس بات کی کوشش تک نہیں کی کہ باہمی میل ملاپ بڑھا کر اپنی سلطنت کو ایسی ترقی و استحکام بخشیں۔ جیسی کہ مغربی اقوام نے مل ملا کر آج کل پیدا کر لی ہے۔ میرا یہہ عقیدہ ہے کہ اس وقت کے راجگان ہند انسان کمزوریوں سے آگاہ ہوکر اصلاح و ترقی کی کوشش کرتے تو شاید دوسری اقوام کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرات کبھی نہ ہوتی یہہ سب سچ ہے لیکن آسمانی انتظام سے بھی مفر نہیں۔ جب ریگستان عرب سے لوائے امن و امان بلند ہوا اور تمام عالم کو توحید کی دعوت دیگئی تو اہل عرب کی نظریں چار سو دوڑنے لگیں تبلیغ کے پیام مصر و افریقہ و اسپین پرتگال تک ایک طرف اور دوسری طرف جاوہ ہندوستان اور روس و چین تک جانے لگے۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے زمانے ہیں

ہندوستان سے رسل و رسائل آغاز ہوئے۔ قاسم بن محمدؒ کا حملہ سندھ پر مشہور ہے۔ اور یہی بناء ہندوستان میں اسلامی حکومت کی ہے۔ قاسم بن محمدؒ کے زمانے سے مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں یوں تو شروع ہو چکی تھی۔ لیکن فاتحانہ حیثیت سے جس اولوالعزم شخص نے سب سے پہلے قدم رکھا وہ محمود غزنوی تھا۔ اس نے ایک نہیں دو نہیں متواتر سترہ حملے کئے اس کی بہادری اور علم پروری کی تاریخ شاہد ہے۔

محمود کے بعد خاندانہائے غوری و تغلق و خلجی وغیرہ نے ہندوستان پر حکمرانی کا پرچم اڑایا۔ بالآخر بابر نے ۱۸۲۶ء میں ثابت کر دیا کہ ملکی تہذیب پر اسلامی تمدن غالب ہے۔ پھر مغلوں نے جس طریقے سے حکمرانی کی ہے اس سے ملک کی حالت روز بروز اصلاح پذیر ہوتی گئی۔

مورخان ہند خواہ کچھ ہی کہیں میرے نزدیک مغلوں کی حکومت ہندوستان کے حق میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی

دنیا کو اختلاف سے زیب و زینت ہے مختلف طبیعتوں اور مزاجوں کے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بادشاہوں میں بھی یہہ ضرور نہیں کہ سب کا ایک رنگ ہو۔ ایک حال ہو۔ اس لحاظ سے اگر مغلوں میں ایک دو بادشاہ ایسے بھی گذرے ہیں کہ جن میں انسانی کمزوریاں تھیں۔ تو اسے محض فطرت کا تقاضہ سمجھنا چاہیئے۔ ورہم کو مجموعی حیثیت اور تنقیدی نظر سے مسلمانوں کے دور حکومت کو دیکھنا چاہیئے۔

ن بادشاہوں کی سب سے بڑی خرابی یہہ تھی کہ ہندوستان کو انہوں نے اپنا گھر بنایا کسی نہ اسکو سرائے یا مسافر خانہ نہیں بنایا

ان بادشاہوں نے پانی پت کی فتح کے بعد سے عموماً ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ملکی ترقی کو خوش حالی میں جو ابتدا بیر

حکمرانوں کو اختیار کرنا چاہیئے وہ سب انہوں نے کیں۔ تجارت کی منڈیاں قائم کیں۔ صنعت کو فروغ دیا۔ کنویں کھدوائے۔ پل بنوائے سڑکیں نکالیں عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں بلا امتیاز مذہب و ملت قابلیت کی قدر کی اور بڑے بڑے عہدے ہندو مسلمانوں کو یکساں عطا کرکے اور پھر محبت پیار۔ خلوص و اخلاق سے اپنے دلوں کو معمور رکھا۔ کوئی حدِ فاصل منافرت کی اپنے اور محکوم باشندوں کے درمیان قائم نہیں کی۔ نہ اپنے محلّے الگ آباد کیے نہ اپنی تفریح گاہیں جدا رکھیں۔ جس طرح اپنے علوم و فنون کو فروغ دیا اسی طرح سنسکرت اور ہندی سے متعدد مسلمانوں بہرہ اندوز ہونے کی تلقین کی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ فیضی سنسکرت کا کیسا مشہور عالم تھا۔ اور عبدالرحیم خاں خانان ہندی زبان کا کیسا شاعر غرا تھا۔ اور راجہ ٹوڈرمل و بیربل فارسی

زبان پر کیسی قدرت رکھتے تھے۔ بلکہ تمام مورخین
ہم زبان ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دفتری
سرکاری زبان فارسی کو مقرر کرنے کی تحریک راجہ
ٹوڈرمل ہی نے کی۔

سکندر لودھی کے زمانے تک دھرم داں
ہندو فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اس کا نام
ملکشن بدھیا تھا راجہ نے تجویز کیا کہ کل قلمرو ہندوستان
میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں۔ اس سے
ہندوستان میں اضطراب پیدا ہوا اور چند روز
مشکلیں پیش آئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہہ خیال بھی اس
نے خاص و عام میں پھیلا دیا کہ بادشاہ وقت کی زبان
رزق کی کلید ہے اور درباری کا رہنما یہہ بات
سب کی سمجھ میں آ گئی۔ چند سال کے عرصہ میں بہت
سے ہندو فارسی عربی داں ہو گئے اور دفتروں میں
اہل ولایت کا پہلو دبا کر بیٹھنے لگے یہاں تک کہ
عربی و فارسی الفاظ و زبان کو ہندووں کے گھروں
میں جانے کا راستہ مل گیا۔

اللہ اللہ یہ کیسے لوگ ہونگے کہ اپنے نفس کو
کبھی سرکشی کا موقع نہ دیتے تھے اور آپس میں ایسے
رہتے تھے جیسے کہ ایک ہی گھر کے بھائی بند ہیں
ان لوگوں کی یہی خصوصیات تھیں کہ جن کے سبب
سے ان کے نام آج تک زندہ ہیں مگر ان نامور
لوگوں کی نسلوں کے اخلاق بگڑنے لگے تو سلطنت
کو بھی زوال شروع ہوا چنانچہ اورنگ زیب
کے عہد تک سلطنت کی طنابیں جو مضبوطی سے
قائم تھیں۔ اورنگ زیب کے بعد ڈھیلی ہو کر
ٹوٹنے لگیں اور فساد و بد امنی کا دور دورہ شروع
ہوا تو قدرت کو ترس آیا اور پھر وہی آسمانی انتظام
جاری ہوا۔ ہندو مسلمان دونوں کی تہذیب پر
ایک تیسری قوم کا جو سات سمندر پار رہتی تھی
تمدن غالب آیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان
پر انگریز حکمران ہیں۔ اول اول حکومت
کرنے والے انگریز عجیب اوصاف حمیدہ رکھتے
تھے۔ ان کا سب سے بڑا وصف عدل تھا اور

ابتداء میں ان لوگوں نے جیسا انصاف کیا ہے وہ ہمارے ملک کے اندر قدم جمانے میں ان کا بہت ممد و معاون ثابت ہوا ابتداء ابتداء میں ان لوگوں نے عدل و انصاف کا جو جلوہ دکھایا وہ شاید عادل حقیقی کو پسند آیا اور ان کے ہاتھوں میں عنان حکومت دیدی لیکن انہوں نے قوم میں تفرقہ ڈالنے کی ایسی تدبیریں کیں کہ وہ تھوڑی سی قدیم ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی جھلک بھی جاتی رہی اور وہ عنصر جو دونوں کو متحد کئے ہوئے تھا یکسر فنا ہوگیا یہاں تک کہ آج ہندو اور مسلمان ایسے متغائر ہوگئے ہیں کہ گویا ایک دوسرے کو جانتا بھی نہ تھا۔

ہم کسی اور مضمون میں یہہ بتا چکے ہیں کہ نہ مسلمان ہندوستان سے جا سکتے ہیں نہ ہندو ہندوستان ان کا گھر ہے۔ ہندوستان کی مٹی ان کے خمیر میں آگئی ہے۔ مسلمانوں کے اسلاف میں سے بڑے بڑے بادشاہ بڑے بڑے علماء صوفیاو

امراء۔ وزراء۔ حکماء۔ فضلاء۔ ادباء سرزمین
ہند میں مدفون ہیں۔ حضرت خواجہ اجمیری حضرات
محبوب الٰہی۔ حضرت بختیار کاکی وغیرہ کی زیارت
گاہیں مرجع خاص و عام ہیں سینکڑوں اہل ہنود
ان کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ کئی اسلامی
ریاستیں موجود ہیں۔ ایسی صورت میں محقق کا
تقاضا یہہ ہے کہ اختلاف کو مٹا دیا جائے اور
اور یک رنگی و یک جہتی سے بسر کرنے کی صورتیں
نکالی جائیں۔

جب کبھی سن رسیدہ اشخاص سے ہمیں ملنے
کا اتفاق ہوتا ہے تو ان کو ہم یہہ کہتے ہوئے
سنتے ہیں کہ میاں اگلا زمانہ عجب زمانہ تھا خدا
جانے آج کل کیا ہو گیا ہے۔ نہ وہ برکت ہے
نہ وہ خوشحالی۔ نہ اتفاق ہے نہ یک جہتی
نہ وہ اخلاص ہے نہ پیار۔ اب جدھر دیکھو
خود غرضی و خود بینی رنج و غم بغض و حسد
کینہ و نفاق کے پرچم لہراتے نظر آتے ہیں

کشت خون کا بازار گرم ہے۔ ایک دوسرے
کے خون کا پیاسا ہے وہ لوگ۔ وہ لوگ ان
باتوں کو کہتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں۔
ان کی یہہ سرد آہیں بے سبب نہیں ہیں۔ آئے
ذرا اس پر غور کریں۔

ابتداء میں آریائی قوم اسی خطے میں سے
ساحل گنگا کے کنارے اتری اور سادہ زندگی
بسر کرنا شروع کی۔ رفتہ رفتہ مختلف قبیلوں نے
حکومتیں قائم کیں اور بہت سی ریاستیں ظہور میں
آئیں۔ عہد ہند قائم ہوا۔ اشوکا۔ بکرماجیت بدھ
ایسے راجگان نے اپنی نیک نامی کے جھنڈے
گاڑے۔ گو تم بدھ کو تو ساری خدائی اس حیثیت
سے جانتی ہے کہ انہوں نے تاج و تخت کو ٹھکرا دیا
اور روحانیت کی جانب تمام دنیا کا رُخ پھیر
دیا۔ ان راجگان کا دَور دورہ ختم ہوا تو سر
زمین عرب میں لوائے کلمۃ الحق بلند ہوا۔
قاسم بن محمدؒ نے سندہ پر حملہ کیا اور فاتحانہ

حیثیت سے ایسے اثرات چھوڑے کہ اتنی صدیاں
گذرنے کے بعد آج تک وہ اثرات باقی ہیں۔
ان کے بعد محمود غزنوی نے ہندوستان کو اپنی
جولانگاہ بنایا۔ سترہ حملے کیے۔ اور چند ساعت
کی حکومت پر قناعت کی۔ غزنی کی دل کش فضا
نے ترک وطن پر اس بادشاہ کو آمادہ نہیں
کیا اس کے عہد میں جس قدر علمی ترقیاں ہوئیں
اُن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مگر اتنا ذکر
کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ فارسی کی بہترین تصنیف
اسی کے عہد کی پیداوار ہے۔ شاہنامہ جیسی
زبردست تصنیف ہے سب کو معلوم ہے۔
فردوسی کی عظمت سے تمام دنیا آشنا ہے۔
محمود غزنوی نے اسلام کی بنیادیں دیار ہند میں
مضبوط کر دیں۔ پھر غوری خلجی۔ تغلق۔ مغل
خاندانوں نے فتوحات حاصل کیں۔ ابتدائی
اسلامی عہد کو فی الحال نظر انداز کر کے ہم عہد
مغلیہ کے حالات سے کچھ نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں

شہنشاہ بابر کے خود نوشت حالاتِ ہند بہت دلچسپ ہیں۔ ہندوستانی تہذیب ان کے زمانے تک درجے کمال کو نہیں پہنچی تھی۔ اگرچہ علوم ریاضی و فلسفہ ہند کی شہرت نے چار دانگ عالم پر قبضہ کر لیا تھا۔ جن نئی باتوں کا رواج مسلمانوں کے عہد میں شروع ہوا وہ عجب طریقے سے ہوا۔ بابر نے محمود کی طرح فتح کے بعد اپنے وطن کو مراجعت نہیں کی بلکہ ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا۔ اس کے فرزند ہمایوں کے رحم و تلطف سے دنیا ناواقف نہیں پھر شہنشاہ اکبر کے زرین عہد سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ کیسے کیسے اہل کمال اس وقت جمع تھے۔ اب تک تو سلاطین سابق نے بزورِ شمشیر حکمرانی کی تھی مگر اکبر نے بمصداق

دل بدست آور کہ حج اکبر است

ہندوؤں کے دلوں پر حکمرانی کی۔ ہندو رانیاں محل میں اس طرح رکھی گئی تھیں کہ گویا وہ اپنے میکے میں ہیں محلوں کی ساخت بھی ہندوانی وضع کی تھی

راجہ ٹوڈرمل کی عقیدت اور دفتری زبان فارسی کرنے کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ موجودہ زمانہ کی نسلوں کو جو ہندی اور اُردو کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں صرف اسی ایک تحریک سے سبق لینا چاہیئے۔

راجہ ٹوڈرمل (موتمن الدولہ۔ عمدۃ الملک) کا فارسی میں یہہ شغف فقیر شاہ کو بھی میراث میں ملا ہے۔ ادھر راجہ کا یہہ شوق فارسی ادھر فیضی کا ذوق سنسکرت میں کس قدر محبت و اخلاص کا پتہ دیتا ہے۔ یہہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مذہبی تفریق اس زمانے میں تھی ہی نہیں لکم دینکم ولی الدین کے حکم ناطق پر صلح کل کی بناء قائم تھی۔ بلکہ سب باشندگان ہند متحد اور ایک قومیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور صرف اپنے اپنے گھروں کی چاردیواری تک مذہب یعنے ان کی پرستش کے مختلف طریقے جاری تھے جب حکومت کا سامنا ہوتا تھا تو حکومت

ہید اکرتے تھے۔ حضرت امیر خسرو، فیضی متقدین میں اور مرزا غالب متاخرین فارسی کے جید اور فقید المثال شاعر گذرے ہیں۔ ان کی قدردانی کے واقعات آج ہم سنتے ہیں تو وہ ہم کو افسانے معلوم ہوتے ہیں، مرزا غالب کا یہہ مشہور قصہ ہے کہ دہلی کے ہمع حکومت کے بجھنے سے آپ حد درجہ ملول و افسردہ ہوگئے تھے اپنے اوقات کبھی کبھی کھیلوں میں صرف کرنے لگے ایک دفعہ جب ساہوکار نے نالش کی تو آپ کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ حاکم عدالت تھے۔ ان کے اجلاس پر پہنچے تو اپنے اظہار اور شہادت وغیرہ سب کو ایک شعر میں پیش کر دیا ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور یہہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

یہہ سنتے ہی مفتی صاحب نے رقم قرضہ کی اپنے جیب سے ادا کردی اور مرزا نوشہ بری ہوگئے

اللہ اللہ یہہ کیسے لوگ تھے کہ آج ایسی مثالیں کوئی
ہم کو دکھا سکتا ہے۔ مختصر یہہ ہے کہ اس زمانے
میں دلوں میں پیوستگی تھی آج جدائی ہے اس
جملہ میں جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے امید ہے کہ اہل
دل اسے خوب سمجھیں گے بہرکیف ماضی کو پیش نظر
رکھ کر ہم کو اپنے حال کی طرف متوجہ ہونے کی سخت
ضرورت ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اسلاف
کی سی خوبیاں ہم میں بھی آجائیں۔ اور ہم سے
وہ برائیاں دور ہو جائیں جو ہماری زندگی کیلئے
وبال دوش اور آشوب چشم ہو گئی ہیں۔

شاد صوفی عفی عنہ

مورخہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء

فصلِ بہار

(۲)انشا

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

جن لوگوں کو نیچر پر غور کرنیکی عادت نہیں ہے ان کے نزدیک تو موسم کا تغیر ایک معمولی بات ہے۔ گرمی کے بعد برسات کا آنا اگر قابل خیال ہے تو صرف اس جہت سے کہ چھت کی درستی اور مکان کی مرمت ضروری ہے یا دوشالوں اور اونی کپڑوں کو دھوپ دینکی ضرورت ہے برسات کے بعد جاڑوں اور جاڑوں کے بعد گرمی کا آنا بھی کچھ ایسی ہی باتوں سے توجہ کے لائق ہو جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے نیچر کے سین کو دقیق کتاب تصور کیا ہے جس کا مصنف حکیم علی الاطلاق ہے۔ اُن کے نزدیک ہر نقطہ قابل

غور ہے۔ جس کی تشریح ہوتے ہوتے نیچرل
فلاسفی سا وسیع علم پیدا ہو گیا۔ گھاس پھوس
کیڑوں مکوڑوں کو جب سوچنے والے دماغوں نے
دیکھا تو اُن کو اتنی حکمتوں سے مالامال پایا جن کے
بیان کا نام بوٹنی (علم نباتات) اور زوآلوجی
(علم الحیوان) رکھا گیا۔ اور ان ہی باتوں سے
فلاسفی میں چار چاند لگ گئے۔

فصل بہار جن دلچسپیوں اور فیاضیوں کی
جلوہ گاہ ہے۔ افسوس کتنے اہل دل نے اس کو
اسی نظر سے دیکھا ہوگا۔ جو ان کی خوبی کے سزاوار
ہے اس موسم میں اگر کسی باغ میں جاؤ تو ایک
جلوہ دیکھو گے نہ صرف رنگ برنگ کے دلفریب
پھول ہی بلکہ ہر گھاس کی پتی ایک شان دلفریبی
آنکھوں کے سامنے آئے گی۔ پھول کا رنگ باصرہ
کو اس کی بو شامہ کو اور طیور کی پرجوش نغمہ سنجی
سامعہ کو فریفتہ کریگی۔ اور دل و دماغ پر ایسا عالم
نشاط و حیرت طاری ہوگا جس کا بیان ناممکن ہے

کسی پھول کی بلا کی سادگی اور کسی کی قیامت کی شوخی اور کسی کی غضب کی بُو اور کسی کی دلفریب صورت قدرت کے کمال کا اظہار کریگی۔ اور اگر غور کیا جائے تو پردہ حسن میں نیچر کا جلوہ خاص دیکھنے کے واسطے پھول سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے حُسن انسانی اگرچہ اعلیٰ نمونہ صنعت ہے لیکن اس میں نیچر کا جلوہ خاص دیکھنے کے واسطے ایک ہی ایسی نگاہ کی ضرورت ہے جس سے انسان غریباً بالکل محروم ہیں۔ اگر باغ کو چھوڑ کر ہم جنگل کو نکل جائیں۔ تو وہاں بھی چھوٹے چھوٹے رنگ کے پھول دیکھیں گے۔ جو اپنی کیفیت خاص میں باغ کے پھولوں سے زیادہ بھلے معلوم ہوں گے ڈھاک کی طرف جس کے تین پات مشہور ہیں۔ اگر آپ جائیں تو آپ دیکھیں گے۔ کہ ربیع نے اس کو بھی ایک سُرخ جامہ پہنا دیا ہے۔ اور دور سے کچھ کر بے تکلف یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آتش بے دود روشن ہے۔ اور اگر آتش پرست اس کی پرستش کرتے تو غالباً اس گرم فقرے

سے محفوظ رہتے کہ ان کا محبوب خود اُن کو جلا دیتا
ہے۔ اس خوشنما پھول پر تلیر کی (جو ایک
چھوٹا سا پرندہ ہے) وارفتگی اور نغمہ سنجی دیکھ کر
اس خیالی گل و بلبل کا تصور آئینۂ دل میں پھر جاتا
ہے۔ جس کے وصف میں ہمارے شعرا کے
کلام کے صفحے رنگین ہیں۔ اور شاید شعرائے
فارس نے شیراز کے ہزار داستان کے
بھی نغمے سُنے ہوں گے جن کے سبب اس ذرہ سی
سے جانور کے دل میں گرمیِ الفت کا پتا اُن کو
لگا۔ لیکن معاف کیجئے۔ شعرائے دہلی و لکھنؤ
کے واسطے جس طرح ہزار داستان شیراز ایک
خیالی مضمون ہے۔ اسی طرح یہہ پرندہ ہوتا کیونکہ
اس کی وارفتگی دیکھنے کے واسطے بھی ان کو
دیہات میں تکلیف اٹھانی پڑتی۔
فصل بہار کے آنے سے پہلے جس سختی اور بے
دردی سے بڑے بڑے درختوں کے پتے
گرائے جاتے ہیں وہ اس پر ایک افسوس ناک

اثر کرتا ہے۔ اور یہہ موثر سین ہوتا ہے کہ ہم
سَر سبز درختوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل بے برگ
رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہہ برگ ریزی بمنزلہ
غسل تمام کے ہوتی ہے۔ جو کارکنان بہار سبز
خلعت پہنانے سے پہلے درختوں کو دیتے ہیں۔ بہار
میں جب ان درختوں کے قریب ہوکر گزرو تو
ان کی بھینی بھینی خوشبو متوالا کردیتی ہے۔ اور
یہہ کچھ اس انداز سے ہلتے ہیں کہ یہہ معلوم ہوتا ہے
گویا اپنی بو سے خود مست ہیں۔ جنگل کی جھاڑیاں
جو ہمیشہ مسافرانِ صحرا کے دل میں کھٹکتی رہتی
ہیں۔ اس فصل میں اپنے کانٹوں کی ایذا کا
بوئے خوش سے معاوضہ کردیتی ہیں۔ اس کیفیت
کو دیکھکر یہہ خیال ہوتا ہے کہ زمین میں ایک جوش
ہے۔ جو تمام قابل روئیدگی مادوں کو نکال کر
باہر پھینکے دیتا ہے۔

وحوش و طیور کو دیکھئے تو ان میں بھی ایک
عجب جوش محسوس ہوتا ہے۔ جو ان کی مستانہ

ترانہ سنجیوں اور تمام حرکات و سکنات سے آشکارا
ہوتا ہے۔ اگر ہم خود اپنے آپ کو جانچیں تو فیض
بہار کی تاثیر پائیں گے۔ بہت سے لوگ ایسے
ہیں۔ جن کو کثرت خون کے سبب اس فصل میں
فصد کا قصد کرنا پڑتا ہے۔ آہ کوئی وارفتہ سودائیوں
سے پوچھے کہ یہ بہار کیا ہے۔ اور اس کے جلوے
اُن کے دل پر کیا اثر کرتے ہیں بوئے گل انہیں
کیا یاد دلاتی ہے۔ پھول کی صورت دیکھ کر ان کو
کیا یاد آتا ہے۔ اور نسیم سحری کیا امنگ اُن کے
دل میں پیدا کرتی ہے۔ غالباً جتنے پھول چمن میں
ہوں گے اُن سے زیادہ حسرتوں کے داغ اُن
کے دل پر چمکتے ہوں گے۔ ہائے کیا حسرت تھی
اس کے دل میں جو عالم محویت میں پڑھ رہا تھا۔

فصل بہار اب کے بھی یوں ہی گذر گئی

کسی کے عارض کو اگر دیکھیں تو معلوم ہوگا شاطر
بہار نے کوئی مجمدہ اُبٹنا مل دیا ہے۔ جس کے
سبب عجب شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اور ایسی

آب و تاب معلوم ہوتی ہے جس سے بیسیوں
پژمردہ آرزوئیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ غرض
ہر طرف صانع حکیم کی قدرت کاملہ کا ظہور ہے

فصل گل وہ موسم بہار است
گلزار ہر رنگ و بوئے یار است

پھول

(نثر)

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

کیا چیز ہے اور کس قدر خوش نصیب چیز ہے
کون محفلِ عشرت ہے۔ جس میں اس کا تذکرہ نہیں
کون بزم طرب ہے جہاں اس خوشنما چیز سے
لطف نہیں اٹھایا جاتا زیادہ تعریف کرتے
بھی خوف معلوم ہوتا ہے کیونکہ بلبل اگر میرے ان
خیالات کا جانور نکلا تو ہمیں اپنی رقابت کا الزام
دے گی موسم خزاں کی شکایت کرتے کرتے ہماری
بھی شکایت کرنے لگے گا۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب
قدرت کوئی اپنی بیش بہا صنعت نظر کے سامنے
کر دیتی ہے۔ تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تعریف
کرنے لگئے پھول کے سوا اور کون چیز ہے جس پر

قدرت نے اپنی کاریگری کا پورا زور صرف کر دیا۔ ہونے کو تو ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر خدا جانے خوشنمائی کس قدر کوٹ کوٹ کے بھر دی گئی ہے۔ کہ جس کی آنکھ پڑ جاتی ہے اُسے بھلی ہی معلوم دیتی ہے۔ صحن چمن میں جس میں جہاں اپنی ناز آفرینیوں اور مشاطہ قدرت کی چابک دستیوں کا مقابلہ کرنے کو آبیٹھے ہیں اس کی رونق موسم بہار کے انہیں حسن فروشوں سے ہے جنہیں لوگ پھول کے لفظ سے یاد کرتے ہیں دلفریب عروسان بزم قدرت یعنی پیارے پیارے خوشنما پھول اپنے بے مثل حسن خداداد میں کچھ ایسی کشش رکھتے ہیں کہ دلدادگان یار جن کا دل جمال یار کے سوا زمانے کے کل حسینوں سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ بھی کبھی وحشت دل اُبھرتی ہے۔ تو کوئے جاناں کے عوض صحن چمن میں نکل آتے ہیں اور ان آنکھوں کو بھلے معلوم ہونے والے پھولوں کو دیکھ دیکھ کے

اور بیتاب ہو ہو کے بار بار اس مصرعے کو زبان سے اُبھراتے ہیں ع

اے گُل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

باغ کی زینت صرف نظر فریب اور رنگ برنگ پھولوں سے ہے۔ سُہانے اور جاں فزا وقت صباح میں سطح ارض کے ہر حصے سے ایک قسم کی بشاشت اور مسرت نمایاں ہوتی ہے جانتے ہو۔ کیوں۔

صرف اس وجہ سے کہ وہ ان قدرتی حسینوں کو مسکرانے اور شگفتہ ہونے کا وقت ہوتا ہے اس وقت یہہ اپنے حسن عالم فریب پر ناز کرنے والے پھول بے تحاشہ ہنسے پڑتے ہیں۔ اور جوشِ خود پرستی کی ہنسی ان سے ضبط نہیں ہوسکتی ان کی اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے ور اسی وجہہ سے ان کے جذبات خدا جانے کس کس کو کہاں کہاں سے کھینچتے ہیں اور صحن چمن میں لاکے کھڑا کر دیتے ہیں۔

بسبم جو نہیں معلوم کن جنگلوں کی ہوا کھاتی پھرتی تھی۔ ان کی سیر دیکھنے کے لیے آتی ہے اور نونہال چمن کے اِدھر اُدھر آہستہ آہستہ خوش خرامیاں کرنے لگتی ہے۔ نازک وانیٔ طیور اڑ اڑ کے آتے ہیں۔ اور درختوں کی نازک ٹہنیوں پر بیٹھ کے جوش سرور میں چہچہانے لگتے ہیں۔ نور سحر کی دھیمی دھیمی شعاعیں افق مشرق سے آتی ہیں اور تر و تازہ سبز پوش خوش قد ان کے دامنوں سے چمن چمن کے رنگین پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑتی ہیں۔ اور ایک نئی بہار پیدا کردیتی ہیں۔ آسمان کے جھلملاتے ہوئے تارے اس دنیا کی بہار کو اپنی واپسیں نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی کرنیں جواہر قطرۂ شبنم میں دلچسپ جھلکیاں دکھا دکھا کے زمین کو بھی آسمان کا نمونہ بنائے دیتے ہیں جس کا مطلب یہہ ہوتا ہے کہ گویا تارے بھی خوشرویان چمن کی بزم سرور کے مہمان ہیں۔ وہ حسن پرست

جنھیں نظر بازی اور قدرتی صناعیوں کی قدردانی
کا لپکا ہے۔ اور کسی بات میں تو ان کا دل نہیں لگتا
اس وقت ٹہلتے ہوئے ادہر نکل آتے ہیں۔ اور نوجوانا
چمن کے آس پاس ایک لطف کے ساتھ ٹہلتے پھرتے
ہیں غرض ہر طرح کے زندہ دل مہمان جمع ہوتے ہیں
اور ان کی خاطرداری کے لئے پھولوں نے اپنی
خوشبوئیں چاروں طرف کی فضا میں پھیلا دی
ہیں اور باغبان فطرت نے اپنی اس نکھری محفل
کی رونق کے لئے بہار باش پر تر و تازگی کی ایک
اور نظر فریب چلا بیبر بچھیر دی ہے مگر اس محفل
کی ساری رونق کس چیز سے ہے۔ یہہ کس کے
جذبات ہیں جو ان زندہ دل مہمانوں کو دور دور
سے یہاں کھینچ لائیں ہیں۔ ان سب کا اصلی مرجع
شاہدان چمن یعنی پیارے خوشنما پھولوں کا جلوہ
ہے۔

خندہ گل کو ہمیشہ شعرا نسیم جاناں تصور
کیا کئے ہیں۔ شعرا در کنار ہر قسم کے نازک

دماغوں نے پھولوں کو باغ قدرت میں سے منتخب
کیا ہے اور یہہ انتخاب ایسا ہے کہ آج تک کوئی
نکتہ چین نہیں کر سکا۔ ہر موقع اور ہر محل پر
آپ کو یہی نظر آئیگا کہ شاہدان باغ کسی موقع
پر خود معشوق ہوتے ہیں۔ اور کبھی نوجوانان چمن
کے نازک چمکتے ہوئے اعضا یعنی ٹہنیوں کے
زیورین کے نمودار ہوتے ہیں۔ ان کو ہر مذاق
اور ہر سوسائٹی نے اپنی دلچسپی یا رونق کے لئے
منتخب کیا ہے۔ وہ نازک ادا اور نازک دماغ
جو اپنی دلربائیوں اور دلبرین کی وجہ سے
حسن کی دنیا میں خود بھی منتخب کئے گئے ہیں انہوں
نے اپنے سچے اور اچھوتے مذاق میں پیارے
خوشنما پھولوں کو دنیا بھر میں سے بطور عمدہ
سامان حسن کے چن لیا ہے۔
غور کرنے کی جگہ ہے کہ یہہ پھول کس کس طرح
سے اور کس کس خوبی سے ان کے کام آتے
ہیں۔ کانوں میں پھولوں کی بجلیاں ہوتی ہیں

کا بنا ہوا ہے وہ سادہ مزاج کوہستانی دلربائیں
جن کو زمانے اپنے پر تکلف سونے چاندی اور
جواہرات کے زیور سے محروم رکھا ہے انکے
لئے تونے اپنا قدرتی حسن دان کھول دیا ہے
جس سے نکال نکال کے وہ خوش نما اور
خوبصورت پھول اپنے سروں پر آراستہ
کرتی ہیں یہی وہ زیور ہے جو دنیا کے غریب
سے غریب اور سادے سے سادے پری
رُخ کے کام آتا ہے۔ اور ہزار پر تکلف
زیوروں سے زیادہ بہار دکھاتا ہے۔
وہ سارے حسن جو کوہستانوں اور صحرائی
گاؤں میں نظر آتے ہیں۔ جن کی طرف سے
نیچر دنیا بھر کو لاپروا کر دیتا ہے۔ اور جنھیں
اپنی مشاطگی کے لئے منتخب کرتا ہے انکے
سادے حسن کی رونق صرف انہیں خوشنما
پھولوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتی ہے جن سے
آفتاب صبح کی شعائیں کھیلتی ہیں اور جن کے

سے ہتھ نسیم سحر کے جھونکے شوخیاں کرتے ہیں۔
اے پھول۔ تو اس سے بھی زیادہ ہمارے
کام آتا ہے تو ہماری زندگی کا ہی نہیں ہمارے
مرنے کا بھی رفیق ہے۔ وہ کیا حسرت ناک
مقام ہوتا ہے۔ جب دنیا انسان کو چھوڑ دیتی
ہے۔ اپنی ساری راحتیں تمام دولتیں ہر قسم
کی دنیاوی دلچسپیاں ہم سے چھین لیتی ہے
ایک ٹوٹی ہوئی اور کم حیثیت قبر ہمارا بستر راحت
یا مصیبت ہوتی ہے۔ پوری پوری سنا ٹے کی
ہیبت اور خوفناک راتیں اس گوشۂ تنہائی
میں ہم پر گزرتی ہیں۔ صبح ہونے کو ہوتی ہے
اس موقع پر نہ کوئی مونس ہوتا ہے نہ ہم درد
نسیم سحر کے جھونکے بھی یہ قہر ڈھاتے ہوئے
سے ہیں کہ رات بھر کی جھلملاتی ہوئی شمع
کو ....ت کے تھپیڑے دے دیکر گل کر دیتے
ہیں۔ ور تیری خوشبو کو ادھر اودھر اڑا
لے جاتے ہیں۔ اس وقت ہمیں کسی

ہم درد کی صورت نہیں نظر آتی ہے۔ ہاں
آفتاب سحر کی ہلکی ہلکی روشنی میں تو نظر آتا ہے
اور دل کو ایک تسلی سی ہو جاتی ہے۔ نازک
نازک اور پیارے پیارے پھولوں کی چادر
ان بے نصیبوں کی قبروں پر بچھا دی جاتی ہے
جنہوں نے دنیا کی ناکامیوں سے مایوس ہوکر
نہایت حسرت واندوہ سے جان دی ہے
دنیا کے تمام سامان عشرت اور کل دلچسپی کی
چیزیں پہلی ہی منزل پر مسافران عدم کا ساتھ
چھوڑ دیا کرتی ہیں۔ عزیز و اقارب۔ دوست و
احباب سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اے
وفادار عروسانِ چمن تمہارا ساتھ ہرگز نہیں
چھوٹتا۔

بھیڑ کا بچہ

شبنم گرنی شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر
تارے کچھ چمکنے لگے تھے۔ یکایک کان میں
آواز آئی "میں" نے پیارے پی لے" چلتے چلتے
میں ٹھہر۔ جھاڑی سے سر اونچا کرکے دیکھا
تو کیا دیکھا کہ ایک برف سے بھی زیادہ اجلا
پیارا سا بھیڑ کا بچہ ہے اور اُس کے پاس ایک
بڑی موہنی صورت کی بھولی بھالی لڑکی کھڑی
ہے۔

بھیڑ کا بچہ بالکل تنہا ہے۔ نہ کوئی بھیڑ پاس
ہے نہ گائے۔ ایک پتلی سی رسی گردن
میں بندھی ہے اور رسی کے دوسرے سرے
کو پکڑے ہوئے ہے اور لڑکی ایک
ٹیلے کی گھاس پر بیٹھی ہے۔ پاس جھکی

ہوئی کٹوری میں دودھ لیے اُسے پلاتی ہے
بچہ لڑکی ہاتھ سے دودھ پیتا جاتا ہے خوش ہے
کبھی کان ہلاتا ہے۔ کبھی دُم۔ جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ بچی بھوک میں سیری کی لذت
محسوس کر رہا ہے۔ لڑکی بار بار یہی کہتی ہے
"پی لے پیارے پی لے" اور یہ جملہ
کچھ ایسے لب ولہجہ میں کہتی ہے کہ اس کا
دل میرے دل میں اُترا چلا آتا ہے۔

اس لڑکی کا نام بار برا تھا اور وہ ایسی
حسین تھی کہ ایسا حُسن کم ہی دیکھنے میں آیا
تھا۔ میں ان دونوں بچوں کو دیکھ کر خوش
ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا پیارا جوڑا ہے
لڑکی بچھڑے کو دودھ پلا کر گھر کی طرف چل دی۔
بچھڑا دو ایک قدم بھی نہیں گر کے پیچھے چلا
پھر ٹھہر گیا۔ اور حسرت سے بچی کی طرف دیکھنے
لگا۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے اس
کے چہرے کی کیفیت۔ دیکھتا تھا کہ اتنی

سی جان میں سچّی محبت اور درد کے کیا کیا رنگ پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر فطرت نے اِس معصوم کو اس وقت موزوں طبع کردیا ہوتا تو شاید وہ اپنے بھیڑ کے بچّے سے نظم میں باتیں کرتی۔ اور اس نظم کا مضمون یہہ ہوتا۔

"پیارے بچّے۔ تجھے کس بات کی تکلیف ہے۔ کیوں اس طرح بے صبر ہوکر گردن کی رسّی گھسیٹتا ہے۔ کیا تیرا جی اچھا نہیں ہے یہاں تیرے کھانے اور آرام کے لئے سب چیزیں اچھی سے اچھی موجود ہیں۔ پھر کاہے کو بے قراری ہے گھاس کا تختہ جہاں تو بندھا ہے۔ اِس کی گھاس بہت نرم ہے اور ایسی ہری ہے کہ اس سے زیادہ کیا ہری ہو سکتی ہے۔ پیارے چین سے بیٹھ۔ آخر کچھ کہہ تو کہ کیا تکلیف ہے۔
کیا کس چیز کو دل ڈھونڈھ رہا ہے۔ کیا کسی

بات کی دل میں آرزو ہے۔ ہاتھ پاؤں تیرے
خوب مضبوط ہیں، صورت شکل کا بھی اچھا ہے
یہہ گھاس بہت نرم ہے۔ یہہ پھول جو تیرے
پاس درختوں میں کھلے ہیں اُن میں کانٹے
نہیں ہیں۔ اور تیرے پاس ہی اناج کا ہرا بھرا
کھیت ہر وقت ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ جس
کی آواز تو سنتا ہوگا۔
اگر دھوپ تیز ہو جائے تو رسّی اتنی بڑی
ہے کہ اُسے گھسیٹ کر سایہ میں آرام کرسکتا ہے
یہاں مینھ بوندی، پہاڑی آندھیوں سے بھی
تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہہ چیزیں
تو یہاں آتی ہی نہیں۔
پیارے بچے۔ بس اب چین سے سو جا اِس
طرح رسّی نہ گھسیٹ۔ گردن دکھ جائے گی
اور وہ دن بھول گیا کہ میرے باپ کو تو یہاں
سے بہت دور ایک جگہ پڑا ملا تھا۔ پہاڑوں
پر بہت سے گلّے چر رہے تھے۔ مگر تجھے کوئی نہ

پوچھتا تھا اور تیری ماں تجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں
چل بسی تھی۔

میرے باپ نے تجھے گود میں اٹھا لیا۔
اور تجھ پر ترس کھا کر گھر لے آیا۔ جس دن وہ
تجھے یہاں لایا وہ دن تیرے لئے مبارک تھا
نہیں تو خدا جانے تو کہاں بھٹکتا پھرتا۔ یہاں
میں تیری کھلائی بنی ہوں۔ میری محبت تو
اس ماں سے کم نہیں ہے جو تجھے پہاڑوں پر
اس دنیا میں لائی تھی۔

دن میں دو دفعہ اس کوٹھری میں تیرے
لئے چشمہ سے تازہ پانی ایسا صاف لاتی ہوں
کہ تجھے محل میں کہاں ملیگا۔ اور دن میں دو
تین دفعہ تیری شبنم سے تر ہوتی ہے۔ اس کٹوری
میں دودھ لاتی ہوں۔ اور دودھ بھی تازہ
اور گرم ہوتا ہے۔ جب تیرے ہاتھ پاؤں جتنے
اب ہیں اس سے بھی مضبوط اور توانا ہو جائیں گے
تو میں اپنی چھوٹی سی گاڑی بھی تجھے اس طرح

لگاؤں گی جیسے بڑی گاڑی میں گھوڑا جوتا جاتا ہے پھر ہم تم دونوں خوب کھیلا کریں گے اور جب ہوا تیز اور سرد ہوگی تو گھر میں آگ کے الاؤ کے پاس میں تیرا بستر لگاؤنگی اور ہمارا سارا گھر تیرا ہی گھر ہوگا۔

ہائے۔ ہائے۔ بچے، تجھے کسی طرح چین نہیں۔ کہیں تجھے تیری ماں تو نہیں یاد کرتی ہے جو تو ایسا بے قرار ہے، ممکن ہے جن چیزوں کو میں نہیں جانتی وہ تجھے عزیز ہوں اور تیرے خیال میں وہ باتیں آرہی ہوں جنھیں نہ تو دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔

پیارے بچے! پہاڑوں کی چوٹیاں جو دیکھنے کو بڑی سرسبز اور خوشنما معلوم ہوتی ہیں میں نے سنا ہے کہ وہاں بڑی تند ہوائیں چلتی ہیں اور گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چشمے جو بہتے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں اور بڑے کھیل تماشے کی جگہ ہوتے ہیں۔ جب

تک بڑی سرگرمی سے ابتری کے دفع کرنے اور
انتظام میں مشغول تھے اور بندوبست کر رہے تھے
کہ عین وقت پر کوئی حادثہ واقع نہ ہو تماشائی اور
سیلانی چھوڑ ے دلی کی صبح کی سردی کی تکالیف
جھیل رہے تھے تاکہ اس تماشے کے موقع پر
جس کا مدت سے انتظار تھا۔ عین وقت پر پہنچ
جائیں۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد آب زدہ وسیع
سڑکیں جو دہلی سے ایمفی تھیٹر کی طرف (جو کہ
کھلے میدان میں کشمیری دروازے سے چار
میل شمال کی طرف واقع تھا) جاتی تھیں اور
نیز دیگر راستے جو مختلف کیمپوں سے آتے
تھے پیدل سوار اور گاڑیوں کے اژدہام سے
کھچا کھچ بھر گئے۔ اس سارے انبوہ کا رخ اس
منزل مقصود کی طرف تھا۔ بعض لوگ لائٹ
ٹرینوں میں بیٹھ بیٹھ کر جا رہے تھے۔ جن کا اسٹیشن
سے ایمفی تھیٹر تک ایک تانتا بندھا ہوا
تھا۔ علی پور کی سڑک پر راجہ لوگ اپنی

فوج اور رسالوں کے ساتھ۔ زرنگار گاڑیوں
میں بیٹھے چوکڑیاں اڑاتے چلے جاتے تھے۔
انگریزی ساخت کی لینڈو یا فٹن سے لے کر لدھو
بیلوں کے چھکڑے اور ہچکولے لگتے ہوئے یکوں
تک ہر قسم کی سواریاں تماشائیوں کی بے شمار
بھیڑ سے بھری ہوئی تھیں جن میں ہزارہا مختلف
صورتیں نظر آتی تھیں۔ کسی میں انگریزی اور
دیسی عہدہ دار تھے کسی میں اجنبی لوگ تھے
جو دریائے ہڈسن اور یارا کے کناروں یا
پریڈ دریا اور ٹوکیوں کے دارالسلطنتوں سے
آئے تھے۔ بعض جگہ شمال مغرب سرحد کے
پٹھان اور خود سر ملک باغستان کے سردار نظر
کرتے تھے۔ اور بعض جگہ بلوچستان کی سطح مرتفع
کے لمبی داڑھیوں اور زلفوں والے جنگ جو
اور چین اور تبت کے غیر مانوس زبان اور
انوکھے لباس والے سرحدی دکھائی دیتے
تھے۔ کہیں کہیں بحیرۂ عرب کے کنارے کے

شیخ وسلطان بھی دیکھنے میں آتے تھے الغرض
سلطنت ہند کے متعلق ہر قسم کا آدمی موجود تھا
حسن اتفاق سے نوروز کے دن مسلمانوں
کے مہینے کی شوال کی پہلی تھی یہ وہ خوشی کا دن ہے
جس روز مسلمان اپنی عید مناتے ہیں۔ آج
ماہ صیام ختم ہوتا ہے اس بزرگ مہینے میں
تمام اہل اسلام ماہ نو کی رویت تک سوائے
سفر کی حالت کے طلوع آفتاب سے غروب
آفتاب تک ہر قسم کے کھانے پینے کو حرام
سمجھتے ہیں۔ چاند رات کو ہر روزہ دار بکمال
ذوق وشوق ہلال کی رویت کا منتظر تھا
صبح کو یعنی دربار کے دن عیدگاہ میں نمازیوں
کا بڑا ابجوم ہوا گورنمنٹ نے اہل اسلام کی
سہولت وآسائش کے واسطے جلسے کے افتتاح
کا وقت دوپہر سے ساڑھے بارہ بجے کا
کردیا تھا وقت سے کہیں پہلے اکثر تماشائی
عہدہ دار اور غیر عہدہ دار ایمفی تھیٹر

پر پہنچ گئے۔ سواریوں اور پیدل آدمیوں کے اس عظیم ہنگامے میں پولیس نے جس خوبی سے انتظام و بندوبست کیا وہ بے شک قابل تحسین و آفرین ہے۔

رؤساء کی سواریاں بیرونی احاطے کے دروازے تک پہونچتی تھیں جہاں کہ ہر ایک کا اس کے منصب کے مناسب استقبال ہوتا تھا اور وہاں سے ان کو ایک پولیٹیکل افسر ان کی خاص جگہ پر لے جاکر بٹھا دیتا تھا۔ اس تزک و احتشام کے ساتھ سو سے زیادہ رؤساء کا استقبال کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ لیکن ان افسروں نے جن کو یہہ خدمت تفویض ہوئی تھی اس اہم کام کو اس خوش اسلوبی سے سر انجام دیا کہ کوئی غلطی اور شکایت نہ ہوئی۔ ہر رئیس کو آنے کے ساتھ وائسرائے کی اس تقریر کا جو کہ وہ دربار کے موقع پر پڑھنے کو تھے ایک اردو ترجمہ پیش کیا جاتا تھا

یہہ وصلی پر سنہری حرفوں میں چھپا ہوا تھا۔ علاوہ
ازیں اور معزز آدمیوں اور درباریوں کو بھی
ایسے ہی ترجمے تقسیم کیے گئے لیکن وہ بجائے
سنہری حرفوں کے سرخ حرفوں میں چھپے ہوئے
تھے۔ الغرض حضار جلسہ میں سے اور خصوصاً تعلیم یافتہ
اور ذی رتبہ لوگ میں سے شاید ہی کوئی ایسا متنفس
ہوگا۔ جو جلسہ کی کارروائی کو باوجود انگریزی زبان کی
ناواقفیت کے اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہو

مینا بازار۔ زنانہ بازار

(۲۱)

مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ

ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں بازار لگتے ہیں۔ اس آبادی کے دور اکثر پانچ پانچ، چھ چھ کوس سے آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں۔ دن نکلے مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں برقع سروں پر۔ نقابیں منہ پر۔ ابر بینم۔ سوت ٹوپیاں، رومال، پھول کاری۔ اپنی دستکاری یا ضرورت کی ماری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں مرد ہر قسم کے پیشے اور اپنی اپنی جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں۔ مرغی اور انڈے سے لیکر گراں بہا گھوڑوں تک اور گزی

گاڑھے سے لے کر قیمتی قالین تک، میوہ جات سے لے کر اقسام غلہ بھس اور گھاس تک۔ تیل گھی۔ مس گری۔ نجاری۔ لوہار کے کام یہاں تک کہ ہٹی کے باسن تک سب آتے جو ہوتے اور دو پہر میں سب بک جاتے ہیں اکثر بین دین مبادلے میں ہوتے ہیں۔ بادشاہ نیک آئین نے اسے اصلاح و تہذیب کے ساتھ رونق دی۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہہ امر آئین میں داخل ہو گا عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہو گا۔

جب جشن کے آداب و آئین شان و شکوہ میں اپنے خزانے خالی کر لیتے اور آرائش و زیبائش کی بھی ساری دستکاری خرچ ہو چکتی تو ان ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے۔ زنانہ ہو جاتا وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا اُن کی

آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں سگھڑاپے
کا سرمہ لگائیں۔ امراء و شرفا کی بیبیوں کو
بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشہ دیکھے
دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں سوداگری
اور سودا، زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔
خواجہ سرا۔ قلماقنیاں۔ اردہ بیگیاں۔ اسلحہ
جنگ سجے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی
تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں۔
مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں
اس کا نام خوش روز تھا۔
نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور
اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش
ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا نہیں خوش ہوتے
ہوں گے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے
بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ۔ بیگم۔ بہنیں۔
بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں۔ امراء کی بیبیاں آکر
سلام کرتیں۔ نذریں دیتیں۔ بچوں کو سامنے

حاضر کرتیں۔ اُن کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں اور حقیقت میں یہہ بھی آئین سلطنت کا ایک جز تھا۔ کیونکہ یہی لوگ اجزائے سلطنت تھے۔ شطرنج کے مہروں کی طرح زور ایک ایک کو پہنچ رہا تھا اُن کے باہمی محبت و عدالت۔ اتفاق و اختلاف اور ذاتی نفع و نقصان کے اثر بادشاہ کے کاروبار تک پہنچتے تھے۔ ان کی نسبتوں کے معاملے خواہ اس جشن پر

لہ عبدالرحیم خاں خانان کو دیکھا کہ بن باپ کا لڑکا ہے اور بیرم خاں کا بیٹا ہے۔ بعض امراء ابتک دربار میں ہیں۔ جن کے دلوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے چنانچہ شمس الدین محمد خاں انکہ کی بیٹی یعنی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بہن سے اس کی شادی کرادی اب بہلا مرزا عزیز کوکہ کب چاہیگا۔ کہ عبدالرحیم کو کچھ صدمہ پہنچے اور بہن کا گھر برباد ہو۔ عبدالرحیم جس کے گھر میں آنکہ کی بیٹی خان اعظم کی بہن ہے اس کے دل میں وہ خیال

خواہ کسی موقع پر ایک مبارک تماشہ دکھاتے تھے۔
کبھی دو امیروں میں ایسا بگاڑ ہوتا تھا کہ دونوں یا
ایک ان میں سے راضی نہ ہوتا تھا۔ اور بادشاہ
چاہتے تھے کہ ان میں بگاڑ نہ رہے۔ بلکہ
اتحاد ہو جائے۔ اس کا یہی علاج تھا کہ دونوں
گھر ایک ہو جائیں۔ جب وہ کسی طرح نہ مانتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کب باقی رہ سکتا ہے کہ اس کا
باپ میرے باپ پر تلوار کھینچ کر سامنے ہوا تھا اور لشکر
خونریز کے ساتھ مقابلہ کیا تھا خانخاناں کی بیٹی سے دانیال
اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ قلیچ خاں کہ سپہ سالار تھا اور
چارہزاری منصب رکھتا تھا۔ اس کی بیٹی سے مراد کی
شادی کر دی سلیم (جہانگیر) سے مان سنگھ کی بہن بیاہی تھی
اور اسکے بیٹے خسرو سے خان اعظم کی بیٹی کی شادی کی تھی وغیرہ
وغیرہ مصلحت اس میں یہی تھی کہ ہر شہزادہ اور امیر کو اسطرح
آپس میں مسلسل اور وابستہ کر دیں کہ ایک کا زور دوسرے
کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

تو بادشاہ کہتے تھے کہ اچھا یہہ لڑکا یا لڑکی ہماری
تمہیں اس سے کوئی کام نہیں۔ وہ یا اس کی
بی بی نا زخانہ زادی سے کہتے۔ حضور لونڈی بھی
اس بچے سے دست بردار۔ آخر حضور ہی کے
لیئے پالا تھا۔ محنت بھر پائی۔ باپ کہتا۔ کرامات
مبارک۔ مگر خانہ زاد کو اب اس سے کچھ واسطہ
نہیں۔ غلام حق سے ادا ہوا۔ بادشاہ کہتے
بہت خوب ہم نے بھی وصول پایا۔ کبھی بیگم
بیاہ کا ذمہ لے لیتیں کبھی بادشاہ لے لیتے
اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں
باپ سے بھی نہ ہو سکتا۔

دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی
بات ایسی نہیں کہ جس کے فوائد کے ساتھ ساتھ
نقصان کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اس آمدورفت میں
سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی
پر آیا۔ اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔
غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی

اکبر نے خود شادی کر دی۔ لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سُنا ہے۔ یعنی مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات پڑی پھرتی تھیں۔ جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آنکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا چاہا کہ توڑے دونوں رکے ہوئے تھے۔ وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادہ نے کہا کہ بوا ذرا ہمارے کبوتر تم لے لو۔ ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونوں کبوتر لے لئے شہزادہ نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے، پوچھا۔ دوسرا کبوتر کیا ہوا۔ عرض کی صاحب عالم۔ وہ تو اُڑ گیا۔ پوچھا۔ ہیں۔ کبوتر اُڑ گیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی

کھول دی کہ حضور یوں اڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا کبوتر
بھی ہاتھ سے گیا۔ مگر شہزادہ کا دل اس انداز پر
لوٹ گیا۔ پوچھا تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔
عرض کی۔ مرزا غیاث۔ حضور کا ناظم ہوتا ہے
کہا۔ اور امراء کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں تم
ہمارے ہاں نہیں آئیں۔ عرض۔ میری اماں جان
تو آتی ہیں مجھے نہیں لائیں ہمارے ہاں لڑکیاں
گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی
منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا تم ضرور آیا کرو
ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے
کوئی غیر نہیں آتا۔

وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جہانگیر باہر
آگیا۔ مگر دونوں کو خیال رہا۔ تقدیر کی
بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم
کے سلام کو محل میں جانے لگی تو بیٹی کے کہنے
سے اُسے بھی ساتھ لے لیا بیگم نے دیکھا بچپن
کی عمر اس میں آداب قاعدہ کا لحاظ سلیقہ

اور تمیز اس کی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ باتیں
چیتیں پیاری لگیں۔ بیگم نے بھی کہا کہ اسے تم ضرور
لایا کرو۔ آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی
شہزادے کا یہہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس
آئے تو وہاں موجود۔ وہ دادی کے سلام کو
جائے تو یہہ وہاں حاضر۔ کسی نہ کسی بہانے
سے خواہ مخواہ اُس سے بولتا بات چیت
کرتا تو اس کا طور ہی کچھ اور۔ نگاہوں کو دیکھو
تو انداز ہی کچھ اور۔ غرض بیگم تاڑ گئی اور
خلوت میں بادشاہ سے عرض کی اکبر نے کہا۔ مرزا
غیاث کی بی بی کو سمجھا دو۔ چند روز لڑکی کو
یہاں نہ لائے۔ اور مرزا غیاث سے کہا۔ کہ لڑکی
کی شادی کردو۔

جب خان خاناں بھکر کی مہم پر تھا۔ تو
طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ
ایران سے آیا تھا۔ وہ مہم مذکور میں کارنمایاں
کر کے اس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا

وہ شریف نواز شریف پرست اِسے ساتھ لایا
تھا۔ اور حضور میں اس کی خدمتیں عرض کرکے دربار
میں داخل کیا تھا۔ اس نے شجاعت اور دلاوری
کے دربار سے شیر افگن خاں خطاب حاصل کیا تھا
بادشاہ نے اس کے ساتھ نسبت ٹھیرادی۔ اور
جلدی ہی شادی کردی۔ یہی شادی اس جوان
نامراد کی بربادی تھی۔ تدبیریں کوتاہی نہیں
ہوئی۔ تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ انجام
اس کا یہہ ہوا کہ جو نہ ہونا تھا سو ہوا۔ شیر افگن خاں
موت کا شکار ہوکر جوان مرگ دنیا سے گیا۔
مہرالنسا بیوہ ہوئی۔ چند روز کے بعد جہانگیری
محلوں میں آکر نورجہاں بیگم ہوگئیں۔ افسوس
نہ جہانگیر رہے نہ نورجہاں رہیں۔ ناموں پر
دہبہ رہ گیا۔

خوشی کی تلاش ہے

(از جناب خواجہ حسن نظامی صاحب)

جو تخت پر بیٹھا ہے کہتا ہے میں خوش ہوں اگر اس کا تخت چھن جائے رعایا سے اوپر اقتدار باقی نہ رہے۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائے تو بتاؤ خوشی کی زندگی کہاں سے لائے۔ اس سے تو جینے کے لالے پڑ جائیں گے تو کیا زندگی کی خوشی بادشاہ کو حاصل ہے ہرگز نہیں۔

جو مصلے پر بیٹھا ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا مذہبی پیشوا بنا ہوا ہے۔ مفت کی روزی مفت کا کپڑا۔ مفت کا رہنا سہنا۔ اور مفت کے ہزاروں لونڈی غلام خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ کیا زندگی کی اصلی خوشی اس کو حاصل ہے مگر پہلے اس کا

خیال کرو کہ اگر اس کے سبب مرید و معتقد
برگشتہ و منحرف ہو جائیں۔ جن کے سہارے
زندگی کی یہہ خوشی اس کو حاصل ہے تو کیا یہ
س وقت بھی خوش رہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔
وہ امیر زادہ جس کو وراثت میں دولت
و جاگیر ملی۔ نوکر چاکر ملے ہزاروں غرض سند
سلامی ملے اگر کسی وجہ سے اپنی دولت اور
جاگیر سے محروم کر دیا جائے تو کیا کوئی نوکر
و خدمت گزار باقی رہیگا اور کیا کوئی
خود مطلبی شخص اس کے سامنے سلام کو ہاتھ
اٹھائے گا اور کیا اس کی زندگی خوشی سے
بسر ہو سکے گی۔ ہرگز نہیں
س حکیم زادہ کو دیکھو بڑے مشہور طبیب
کا بیٹا ہے۔ جس کے ہاں ہزاروں بیمار علاج
کرانے آتے تھے۔ اور طبیب کی طبی قابلیت
کے سبب تندرستی کا فیض اٹھاتے تھے۔
س طبیب زادہ نے طب کی تعلیم کچھ نہیں

پائی۔ محض باپ کے نام کی شہرت زندگی
بسر کراتی ہے۔ حکیم کا گھر سمجھ کر بیمار اب بھی
آجاتے ہیں اور حکیم زادہ کی زندگی کٹ
جاتی ہے۔ یہہ بیچارہ اور کوئی کام نہیں جانتا
کسی قسم کی ذاتی قابلیت اپنے اندر نہیں
رکھتا آج اگر اس کے باپ کی شہرت مٹ
جائے یا اس کی ذاتی ناقابلیت سے بدگمان
ہوکر کوئی بیمار گھر پر نہ آئے تو بتاؤ اس کی
زندگی کی خوشی قائم رہ سکتی ہے ہرگز نہیں۔
پیرزادے صاحب کو بارہا دیکھا ہوگا۔
دادا ان کے بڑے نامی بزرگ تھے ہزاروں
آدمی حلقۂ ارادت سے فیض پاتے تھے۔
سیکڑوں گمراہ اثر صحبت سے راہ راست
پر آجاتے تھے۔ ان پیرزادے صاحب نے
ذاتی قابلیت کچھ پیدا نہیں کی دادا کے
مرید و معتقد اتنی نذریں لاتے ہیں کہ
انہیں زندگی میں اور کچھ کام کرنیکی ضرورت

نہیں پڑتی۔ آرام سے گھر میں بیٹھے ہوئے
کھاتے ہیں اور مزے اُڑاتے ہیں۔ لیکن
اگر یہ مرید کسی وجہ سے پیرزادے صاحب
کو نذریں دینی چھوڑ دیں تو کیا ان کی زندگی
خوشی سے بسر ہو سکے گی۔ ہرگز نہیں۔
مولوی صاحب بڑے خوش بیان واعظ
ہیں۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں
دوزخ و جنت کا سماں آنکھوں کے سامنے
باندھ دیتے ہیں۔ روزانہ دعوتیں آتی ہیں
خلقت اپنے گھروں میں لے جاتی ہے۔ عمدہ
عمدہ کھانے کھلاتی ہے۔ نقدیاں اور کپڑے
نذریں دیتی ہے اگر کسی وجہ سے خلقت اُن کا
وعظ سننا چھوڑ دے اور مولوی صاحب کی
دعوتیں اور نذرانے موقوت ہو جائیں۔ تو
کیا یہ زندگی کا لطف حاصل کر سکیں گے
ہرگز نہیں۔
ذرا سیاسی لیڈر صاحب کو بھی دیکھئے۔

سرکار کے خلاف بڑی سخت تقریریں کرتے ہیں۔ بڑے زوردار مضامین لکھتے ہیں نظر بندی کی تکلیف اُٹھا چکے ہیں۔ آج کل پبلک کا کام کر رہے ہیں۔ خلقت سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے لیکن اگر ہوا کا رُخ بدل جائے۔ پبلک بدگمان ہو جائے۔ اور یہہ اثر اور اقتدار خیال کرتے کو بھی باقی نہ رہے تو ان کو اپنی زندگی کے اندر کچھ مسرت نظر آسکیگی۔ ہرگز نہیں۔

ذاتی عمل پر اعتماد رکھنا اصلی مسرت ہے

ان مثالوں سے یہہ سمجھ میں آجائیگا کہ دنیا میں جو لوگ دوسروں کے بھروسے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کی خوشیاں ہمیشہ دغدغہ میں رہتی ہیں رشد کام زندگی اس شخص کی ہے جو اپنی ذات پر بھروسہ رکھتا ہو اور دوسروں کی بخشی ہوئی خوشی کا محتاج نہ ہو۔ بادشاہ اور تاجدار اگر سلطنت کو سرور زندگی کا باعث نہ سمجھیں اور

اپنی ذات کے اندر ایسی قابلیت پیدا کریں
کہ سلطنت برباد ہو جانے کے بعد بھی وہ بیکار
نہ رہیں اور تباہی حکومت کا کچھ بھی اثر انکی
زندگی پر نہ پڑے اور اپنی ضروریات زندگی
کو اپنی قوت بازو سے کرنے لگیں تو زندگی
کی خوشی مرتے دم تک ان کو حاصل
رہے گی۔ ایسے ہی پیر۔ حکیم۔ مولوی۔ لیڈر
وغیرہ اگر دوسروں کی مدد کی محتاجی کا خیال
چھوڑ دیں اور اپنے اندر ایسی لیاقت پیدا
کریں جس سے بگڑتے وقت وہ خود اپنے
کام آسکیں تو ان کی زندگی ہمیشہ اصلی مسرتوں
کو حاصل کرتی رہیگی۔
اصل مقصد یہہ ہے کہ زندگی کی مسرت
اور راحت اسی شخص کو حاصل ہے جو اپنے
ہاتھ پاؤں پر اور اپنے دل و دماغ پر اعتماد
رکھتا ہے۔ اور اپنے علاوہ کسی غیر کی مدد
اور شرکت کا محتاج نہیں ہے۔ جب اِس

کے پاس دولت ہوتی ہے تب بھی ہاتھ پاؤں سے
کام لیتا ہے اور ہر وقت خوش رہتا ہے اور
جب مفلسی اور پریشانی آتی ہے تب بھی ہاتھ
پاؤں چلاتا ہے اور کسی وقت محنت سے
دم نہیں چراتا۔ اس واسطے باوجود افلاس
و غربت کے زندگی اپنی اصلی خوشیاں اُس کو
بخشتی رہتی ہے۔

میں یہہ نہیں کہتا کہ تم بادشاہ نہ بنو۔ نہ
میں تم کو پیر۔ حکیم۔ مولوی اور لیڈر بننے سے
روکتا ہوں۔ میری غرض تو یہہ ہے کہ تم اپنی
ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرنا سیکھو۔ اگر
بادشاہی تمہارے سامنے آجائے تو اس کو
قبول کرلو۔ اور بادشاہ بن جاؤ مگر اس کے
زوال کے خیال کو کبھی دل سے دور نہ ہونے
دو۔ اور وہ خیال یہی ہے کہ زوال کے وقت
کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھو۔ یعنی اگر کبھی بادشاہت
چھن جائے تو تمہاری مسرور زندگی میں فرق

نہ آنے پائے۔ فوراً دوسری زندگی ہاتھ
پاؤں کی محنت سے شروع کردو۔ اور بادشاہی
جاتے رہنے کا کچھ بھی خیال دل میں نہ لاؤ۔
کیونکہ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے بادشاہ
پیدا نہیں ہوتا اور کوئی شخص مرنے کے بعد
بادشاہ باقی نہیں رہتا۔

میں تم کو اپنی مثال سے پھر سمجھانا چاہتا ہوں
میری زندگی کی خوشی کے تین حصّے ہیں۔ پہلا
حصہ پیرزادہ ہونے کے سبب لوگوں کا عزت
سے پیش آنا۔ دوسرا حصہ میری تحریر پسند
کئے جانے کے سبب کتابوں کی فروخت اور
ان سے روٹی کا حاصل ہونا۔ تیسرا حصہ
مریدوں کی جماعت کا پیشوا سمجھا جانا لیکن
اگر خدانخواستہ میری پیرزادگی کی وقعت
جاتی رہے۔ میری کتابوں کا پڑھنا لوگ چھوڑ
دیں۔ میرے سب مرید مجھ سے برگشتہ
ہوجائیں تب بھی میرا دل زندگی کی اصلی

خوشی سے خالی نہ ہونے پائیگا۔ میں فوراً ریل پر
جاؤں گا اور اپنی طاقت کے موافق مسافروں
کے بوجھ اٹھاؤنگا اور صبح سے شام تک محنت
کرکے آٹھ آنے کماؤنگا۔ اور موجودہ خرچ کو
محدود کرکے غریبانہ کھانا اور غریبانہ کپڑا جبکو
آٹھ آنے روز کافی ہوسکیں اختیار کرونگا
اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے
پاؤں پھیلا کر سوؤں گا۔ اور مجھے موجودہ حالت
کے بدل جانے کا ذرا بھی غم اور افسوس نہ ہوگا
کیونکہ میں دنیا کا محتاج نہیں ہوں۔ دنیا میری
محتاج ہے۔ یعنی میں اس دنیا میں خدا کے لئے
پیدا کیا گیا ہوں اور دنیا میرے لئے پیدا کیگئی
ہے۔ پس جس کے لئے میں پیدا کیا ہوں مجھ کو
اسی کے واسطے رہنا چاہیئے۔ اور دنیا جبکہ
میرے لئے پیدا کی گئی ہے اس واسطے اس
کو بھی مجبوراً میرے قدموں میں حاضر رہنا پڑیگا
پھر میں دنیا اور اہل دنیا کا محتاج کیوں رہوں

مجھے خدا کی محتاجی کافی ہے۔ اور وہ یہی ہے
کہ اس بنائے ہوئے، اور دیئے ہوئے، جس
جسم و بدن میں رہتا ہوں۔ اُسی کی محنت و
کارگزاری پر اپنا دارومدار رکھوں اور اس
کے بعد خدا سے لو لگائے رہوں اور دنیا کے
کسی عروج و زوال سے اپنی زندگی کی مسرتوں
کو آلودہ نہ ہونے دوں کہ مجھ کو خدا نے زندگی
کی اصلی خوشیاں بتا دی ہیں۔
تم بھی اگر چاہتے ہو کہ زندگی کی اصلی خوشی
حاصل رہے تو ہر تکلیف و مصیبت میں صابر
و شاکر رہو۔ اور اپنے جسم اور اپنی ذات کی
ان طاقتوں پر بھروسہ رکھو جو خدا تعالیٰ نے
تمہاری زندگانی کی امداد کے لئے پیدا کی
ہیں جب تک وہ سلامت ہیں تم کسی عروج و
زوال کی پرواہ نہ کرو اور جو کام سامنے
آجائے اس کے کرنے میں عزت و ذلت کا
خیال نہ آنے دو۔

جو شخص ہر اچھے بُرے حال میں صبر و قناعت سے بسر کرتا ہے اور وقت کو بیکار نہیں جانے دیتا۔ اور کچھ کام کرتا رہتا ہے وہ دنیا میں کبھی مغموم نہیں ہوتا۔ زندگی کی خوشی اس کے پیچھے ہاتھ باندھے دوڑی پھرتی ہے۔

خدا کے سوا ہر غیر چیز کا بھروسہ چھوڑ دو اور خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی دی ہوئی اپنی ذات کے عمل پر اعتماد رکھو کہ دنیا میں اپنی ذات، اپنے جسم، اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی عقل اور اپنی دولت کے سوا کوئی کسی کا نہیں ہے۔ سب غرض اور اپنے مطلب کے بندے ہیں۔ لہذا سب سے بے تعلق ہو کر اپنی ذات کے عمل سے تعلق پیدا کرو۔

مُردہ بدستِ زندہ

(افسانہ)

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب معتمد عدالت العالیہ)

زمانے نے خلوص، دلوں سے مٹا دئے ہیں سچی محبت کی جگہ، ظاہر داری نے۔ لے لی ہے نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری میں دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مرگیا ہے اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ لوگ یہہ نہ کہیں کہ واہ۔ جیتے جی تو دوستی ومحبت کا یہہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ پوچھا کہ کون مرگیا۔ اب وہی دل کی حالت

تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔
یہ دیکھیئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں سیکڑوں آدمی جمع ہیں موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے۔ وہ ان باہر والوں میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ مر گئے ہمارے تو بڑے دوست تھے۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے۔ تعریف ختم ہو چکی۔ اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھیڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی

شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہہ دیکھتے ہی دروازہ کے سامنے کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ پیچھے پیچھے یہہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے ان ساتھ والوں میں تقسیم شروع ہوئی اور چپ، چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا۔ انہوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے.......
یہہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لئے اجرت پہ بلایا گیا تھا اس کے پیچھے وہ لوگ رہے

جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرماشرمی
پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ
طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں
تک پہونچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا اگر پیدل
چلنے والوں میں کوئی عمدہ دار ہیں تو غرضمندوں
سے اُن کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا۔
جُھکا۔ کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی
کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے
اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں
اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی
خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے
واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ
چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے۔ اور
انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے
شروع کئے۔ غرض اسی طرح جوڑی
بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔
یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے

ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے اور اب
بھی پڑھیں گے۔ دوسرے وہ ہیں
جو نہا دھو کپڑے بدل خاص اسی نماز
جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ
ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں۔ یعنی
نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھینگے
دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے
پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا
بھی نہ تھا ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا
کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے
ہو گئے اور سگریٹ پی کر پان کھا کر انہوں نے
وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا
کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر
نماز ختم ہوئی اور ادھر یہ لوگ مسجد کے
دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر سے
جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے بس یہی معلوم
ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے

نکل رہے ہیں۔
یہہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سنئے۔ اگر میت کیساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آتے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور رفوچکر ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات انہیں سے تفویض کر دیا ہے۔ اور یہہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہیں کے لئے بنی ہیں کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو ہر موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے

اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا
نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مرکران کے
پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن
پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے
اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ تیڑھا
ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب
کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار
سے نکلے گی۔ اور ضرور نکلے گی یہہ لوگ تو
وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی
ہارن بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کرینگے
خیر کسی نہ کسی طرح یہہ تمام مصیبتیں اٹھا کر
جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے
کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت
بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے خاصہ ایک
جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی
ہے اس میں ایک سقے صاحب اُن کی بیوی

دس بارہ بجے پانچ چھ بکریاں۔ ایک لنگڑا
ٹٹو۔ سو دو سو مرغیاں۔ پانچ چھ بلیاں اور
خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔
جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس
بڑھ کر کمر کمر برابر ہو گئی ہے۔ دیواریں
توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔ نیم
پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت
قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ نکل آئے ہیں
کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا
تعویذ ہی غائب ہے کسی چبوترے کی اینٹیں
نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض
کسمپرسی نے اس حصے کی عجب حالت کر دی
ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں
وہ کسی قدر صاف ہے۔ اور کیوں نہ ہو
پہلے حصہ کا مردوں سے تعلق ہے اور
دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو
اپنی قبروں کی مرمت کرنے یا کرانے سے

رہیے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ
اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن
کی زمین ہے وہ تو روپیہ کھرے کر چکے اب
ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصّے کا
صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے
جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکان دار
اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے
تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپیہ گزوالی
زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت
اچھا مال دیکھ لو۔ پھر تم جانو اور تمہارے
مردے۔

میاں سقّے رہتے تو قبرستان میں ہیں۔ مگر
ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ
قبر پر پھول چڑھا کر گئے۔ ادھر ان کے بچے
سب نے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ
پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لیجا کر پھر
قبر پر چڑھا دئے۔ خیر کیا ہرج ہے۔ زندوں کا

کام بھی نکل گیا۔ مردے بھی خوش ہو گئے۔
اس گھر میں سل بٹا کبھی خریدنے کی نوبت
نہیں آتی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالح
پیس لیا ہے۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے
نہ آیا تو پتھر اکھاڑ چھونپڑی کے پاس لا رکھا
بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔
مرغیاں کبھی قبروں کو کرید رہی ہیں۔ بچے
یا تو چھونپڑی پر لوٹ مار رہے ہیں۔ یا تعویذ کو
گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر
بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔
کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اس
پر سقنی نے گیہوں سکھانے ڈالے ہیں۔ ٹٹوانی
کی ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ
دیا ہے وہ قبروں میں گھس چرتی پھرتی ہے
اس کے اِدھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی
اینٹ گری کسی کا چونا گرا کسی کا پتھر گرا۔ اگر
ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دے جائیں

تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا۔ فوج میں ترزم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لئے لائن باندھ کر آ بیٹھا کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی ہوئی رکابی کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ [illegible] کی کیفیت سنئے۔ جنازہ [illegible] کر لب [illegible] رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک [illegible] ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک [illegible] [illegible] کو زمین سخت ہونے کی شکایت [illegible] [illegible] صرد [illegible] کو سست

کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا بھلا کہتا ہے جب اِس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لیکر پیئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جاتی ہے۔ سلفے پر سلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد ہی کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض صاحب ہیں کہ گھانس سے بچتے بچتے قبروں کو کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں یہہ کون ہیں یہہ وہ صاحب ہیں جن کے

مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں
یوں تو خدا نخواستہ فاتحہ کے لئے کیوں آنے لگے
آج شہر اشرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت
کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی
پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا
عزیز یا دوست مریگا تو پھر دیکھا جائے گا
ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی
پڑھتے پھر رہے ہیں کچھ نوٹ بھی کرتے
جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے
دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور
بجائے فاتحہ پڑھنے کے وادسخن گوئی دیگئی
کچھ اپنا کلام سنایا کچھ ان کا سنا۔ عرض کوئی
نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی لیا۔
جو لوگ چبوترے پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ
پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے۔ اور
ہر قبر کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی قبروں
پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں

پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ دعوے لئے جا رہے ہیں غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا تو وہ جو ہونا چاہیئے۔ اور جس کی غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے کچھ تو اُٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دے دو صاحبوں نے سٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اُٹھایا آٹھ دس نے غل مچایا سنبھال کے سنبھال کے۔ میت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے۔ آہستہ سے اب میت قبر کے منہ تک آ گئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا۔ اور قبر کے گرد جو لوگ

کھڑے تھے انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے جانے دو پاؤں کی طرف سے جانے دو۔ کوئی کہتا ہے ذرا کمر کی چادر کو کھینچو ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں تہہ کا پاکھا نہ گرے۔ ہاں ہاں ذرا اور جھکا کر لا الٰہ الا اللہ۔ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ بس بس بھئی بس کوئی چیخ رہا ہے مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں تو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا۔ بس بھئی بس۔

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک

پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آئی ہے اس
میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوئی ہے۔ کوئی کہتا ہے
یہہ کڑی نہیں وہ کڑی لو۔ کوئی کہتا ہے لاحول
ولا قوۃ۔ مفت میں سو روپیہ مار لئے۔ اور کڑیاں
دیں تو ایسی۔ غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔
اور اس گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور
مٹی دینے کی نوبت آئی ہے۔ مٹی تو ہر ایک
دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے۔
لیکن یہہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے
وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ منہا بہت
اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب
الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دئے جاتے ہیں
جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار
ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنیوالوں میں
کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔
ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں
کوئی بھی نہ ہونگے جو یہہ جانتے ہوں کہ فاتحہ

ہیں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی
سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی ۔ یہہ بھی
پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور
ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے
ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے
چکا کر لائے تھے۔ مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں
پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ میت بہت
بھاری تھی کبھی کہتے ہیں کہ فاصلہ بہت تھا
کبھی کہتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے دوسری
میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ
کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا۔ بہرحال ان
مصیبت زدوں کو دق کر کے یہہ مزدور
کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانے کی بینت
کا رنگ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا
یا نہیں۔ اب سوائے اس کے کیا ہے کہ

خدا سے دعا کی جائے کہ ان اللہ تعالیٰ کے
بندوں کو نیک ہدایت دے ۔ ان کے دل
میں درد پیدا کرے یہہ سمجھیں کہ احکام کیا
ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں ۔

بندر راج

(۱)

مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ سرکار عالی۔

زلفی نے آج تک ہندوستان کا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا ان ویرانوں پر نظر پڑی تو ہر چیز خوشنما معلوم ہوئی کسی زمانے میں کوئی بڑا راجہ تھا۔ جس نے ایک پُر فضا سرسبز پہاڑی پر اس شہر کو آباد کیا تھا۔ لیکن مدت سے انسان کا وہاں گزر نہ رہا تھا جنگل نے چاروں طرف سے اُس کو گھیر لیا تھا۔ اور خود رَو درختوں نے اس کی شاندار عمارتوں کو چند روزہ حسن دیکر غارت کرنا شروع کردیا تھا اکثر عالیشان محلوں کے کچھ کچھ حصے باقی تھے شہر کے اونچے اونچے دروازے شکستہ

حال اب تک موجود اور بُرجیاں اُن پر قائم تھیں۔ پختہ روشوں کے آثار کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے۔ دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی تھیں۔ جہاں سے پتھر اکھڑے تھے وہیں کوئی جنگلی بیل یا خودرَو درخت پھوٹ نکلا تھا اور اس کا ہریاول در و دیوار پر چھایا تھا۔ کہیں کہیں کسی شکستہ دیوار کے سائے اور درختوں کے جھُرمٹ نے مل جل کر تنہائی کے گوشے نہایت دلچسپ بنا دیے تھے۔ شہر پناہ کے کنگورے اور تھوڑی تھوڑی دُور پر فصیلوں کے برج بھی شق ہو کر آدھے خندق میں پھسل پڑے تھے۔ بُرجوں کے ستونوں پر ہری ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور دریچوں میں جنگلی درختوں کی شاخیں باہر نکل کر ہر وقت ہوا کے جھونکوں سے جھومتی تھیں۔ خندق میں کہیں کہیں برسات کا پانی بھرا تھا اور اسمیں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پیاری پیاری جانیں اُچھل اُچھل کر چاندی کے

پتروں کی طرح چمکا کرتی تھیں۔ اور نہائے
دھوئے جل کوتے صبح سے شام تک ان کے
فراق میں پانی کے اوپر اوپر ہوا میں پھرکیوں
کی طرح پھرا کرتے۔ دس پانچ ڈبکیوں میں
دو چار مچھلیوں نے پوٹا بھر دیا تو خوش ہو کر
اُڑ جاتے کہ دوسرا پانی دیکھیں۔
ویرانے کے بیچوں بیچ پہاڑ کی چوٹی پر
راجہ کا محل تھا۔ چھت کبھی کی گر چکی تھی فقط
در و دیوار باقی تھے۔ محرابیں موجود نقش خشک
نہر کے کنارے چوپڑ کا فرش اور سنگ مرمر
کے فوارے ٹوٹے پڑے تھے۔ درختوں کی
جڑوں نے فرش کے پتھروں کو توڑ پھوڑ کر ناہموار
کر دیا تھا۔ اور سنگ مرمر کی سلوں پر سبز
رنگ خ د ن پڑ گئے تھے محل کے چبوترے
پر مہتابی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو چاروں
طرف کی کالی دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔
چھت کسی مکان کی باقی نہ رہی تھی۔ پختہ

سڑکوں کے کنارے جہاں اب گڑھوں میں پتھروں
کے ڈھیر پڑے ہیں۔ یہہ کسی وقت میں بڑے
بڑے اندارے اور پن گھٹ تھے۔ یہاں
پیاری پیاری لڑکیاں جن کے ہنسنے بولنے کے
دن تھے۔ آپس میں چہلیں کرتی پانی بھرا کرتی
تھیں۔ چوراہے پر جو ایک بے ڈول سے پتھر کا
ٹکڑا پڑا ہے یہہ کسی دیوتا کی مورتی تھی۔ جس پر
روز صبح سویرے پھولوں کے ہار چڑھا کرتے
تھے۔ وہ ٹوٹا برج جہاں پیپل کے بہت سے
چھوٹے بڑے درخت اُگ آئے ہیں جن کے
پتے دھوپ میں چمک چمک کر ہوا کے جھوکوں سے
تالیاں بجاتے ہیں یہہ اس شہر کا عالی شان
مندر تھا۔ یہاں صبح و شام سنکھ اور گھنٹے بجتے
تھے۔ پجاریوں کے میلے لگے رہتے تھے۔
مگر اب وہ صورتیں کہاں۔ وہ راج رہا نہ
پاٹ۔ بستی کے بسنے بسانے والے سب
خاک میں مل کر خاک ہوگئے۔ اب تو یہہ

ایک ویرانہ ہے۔ اور اس پر بندروں کی
حکومت کا ڈنکا رات دن پڑا بجتا ہے
وہ اس شہر کو اپنا شہر مشہور کرتے اور یہ
خود شہری بن کر جنگل والوں کو دہقانی بنانے
ہیں۔ مگر آج تک ان مسخروں کی سمجھ میں
نہ آیا کہ یہ محل اور مکانات کس نے بنائے
تھے اور کیوں بنائے تھے اور ان میں
کس طرح رہنا چاہیئے۔ مگر زعم یہی تھا
کہ ہم ہر بات میں انسان کی نقل اتار سکتے
ہیں۔ راجہ کے محل میں جہاں کبھی درباریوں
کا ہجوم رہتا تھا۔ سیکڑوں بندر ایک کے
پیچھے ایک بیٹھ جاتا اور بجائے اس کے کہ
رموز سلطنت پر سرگوشیاں ہوں۔ ایک
کی جوئیں ایک دیکھ دیکھ کر کھاتا تھا اور
مشغول رہتے اس درجہ محو ہوتے کہ تھوڑی
دیر میں سب کا جی گھبرا اٹھتا اور فوراً
نوچ کھسوٹ شروع ہو جاتی۔ بیس بیس

تیس تیس بندروں کی ٹولیاں بندھ کر ادھر
گھس ادھر بیٹھ۔ دس پندرہ دالان میں گھس
کمانچے میں آئے ہیں تو پانچ کمانچے سے اُچک
شہ نشین پر پہنچے۔ ایک جوڑا چھجے پر سے کود
صحنچی کے طاق میں سر دکھاتا تو دوسرا زینہ
سے چڑھ سراپردہ سے برآمد ہوتا تخت پر
ناچ دکھاتا اور اس غریب بوڑھے بندر کو
چھیڑتا جو سائبان کے قلابے میں تن تنہا لٹکا
نیچے گودڑوں کی یاد میں مصروف ہے۔ غرض
دس دس کے پیچھے بیس بیس اور بیس بیس کے
پیچھے تیس تیس بندر ہیں کہ اِدھر سے اُدھر
اور اُدھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ کبھی
کبھی بہت اہتمام سے چونے کے ٹکڑے دیوار پر
سے اکھیڑ کر صدر کی جانب ایوان خاص کے
گوشے میں جمع کئے جاتے ہیں۔ کبھی صحن چبوترہ
کی اینٹیں نکال نکال کر اُن کے ڈھیر سنگ مرمر
کے تخت پر چنے جاتے ہیں اور یہہ بھول کر کہ

چونے اور اینٹوں کے خزانے کہاں جمع کیے تھے تفتیش شروع ہوتی اور دوران تفتیش میں خفیف سی رنجشیں پیدا ہوکر دفعتہً اِس زور کی لڑائی ٹھنتی کہ سیکڑوں بندر لہو لہان ہو جاتا اور بندریاں بچوں کو کلیجے سے لگا دور جا بیٹھتیں پھر کوئی خیال یکایک ایسا پیدا ہوتا کہ تیس تیس، چالیس چالیس بندروں کی گروہ بندی ہو جاتی۔ اور سب کے سب پائیں باغ میں جاکودتے جہاں ابھی تک پھولوں اور میووں کے درخت خودرَو حالت میں پھولا پھلا کرتے تھے۔ ایک غول رنگتروں میں سے نکل کرنا شپاتیوں میں پہنچا تو دوسرا امرودوں سے نکل کھجوروں کے جھنڈ میں جاکودا۔ ایک نے چمن کی روش پر گلاب کے تختوں کو روند مارا تو دوسرا محض گھاس پر لوٹنے لگا۔ درختوں کو ہلا ہلا کر پھولوں کی بوچھار پر ہنسیاں ہو رہی ہیں اور اُن کے ستھراؤ پر قہقہے لگا رہے ہیں باغ و

چمن تو خیر اپنی جائداد تھے۔ محلوں میں بھول
تہ خانہ۔ کوئی بھول بھلیاں۔ کوئی تاریک
سُرنگ کا رستہ ایسا نہ تھا۔ جس کو انہوں نے
بار بار تحقیق نہ فرمایا ہو۔ لیکن خاک یاد نہ رہتا
تھا۔ کہ کون سی چیزیں دیکھ چکے ہیں۔ اور کونسی
دیکھنی باقی ہیں۔ اور پھر دو دو چار چار مل کر
گردن میں باہیں ڈالے محلوں میں ٹہلتے پھرتے
اور فخر کرتے کہ جس طرح آدمی یہاں آباد
تھے اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے
تھے اسی طرح ہم بھی اس شہر میں آباد ہوئے
ہیں۔ پختہ تالابوں اور سنگ مرمر کے پاکیزہ
حوضوں سے پانی پیتے۔ اور تھوڑی دیر
میں نرمل جل کو گندہ کر کے کیچڑ کر دیتے اور
پھر پانی پر لڑائیاں ہوتیں جو خشکی کی لڑائیوں
سے ہرگز کم نہ تھیں اور ابھی ان لڑائیوں
کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا کہ اپنی تعریفوں کے گیت
شروع ہو جاتے۔ قصیدہ پر قصیدہ پڑھا جاتا

کلام میں اس بلا کی شورش ہوتی کہ چیختے چیختے آوازیں بیٹھ جاتیں۔ اور محمد حسین کی چینڈ میں مداحین کے پنجوں کی داد دیتے دیتے گنجی ہو جاتی تھیں اور پھر یہی حرکتیں اور ان کے متعلق مضامین از سر نو شروع ہو جاتے۔
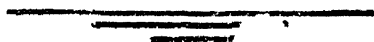
(جناب کوثر صاحب چاندپوری)

سلیم خوبصورت تھا اور اس کے اعضاء میں
وہ تناسب بھی موجود تھا جو انسان کی خوبصورتی
میں دلکشی اور دلربائی پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک
بڑے خاندان کا فرد تھا۔ لیکن باپ کا سایہ سر سے
اُٹھ جانے کی وجہ سے تربیت اچھی نہ پا سکا جب
تک انجام کار پر اس کی نظر نہ تھی وہ آزادآ
اپنی زندگی بسر کرتا تھا پہلے پہلے اسے یہہ
بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس کے مصارف کس
طرح پورے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ
معاش کیا ہے کسی نے اسے بتایا کہ اس کے
ماں باپ نے صرف ایک پختہ مکان چھوڑا

تھا جس کو اس کی بہن "رابعہ" نے دو ہزار
میں فروخت کرکے اپنی ضروریات میں لگا دیا
سلیم اب تک اپنی بہن کے پاس رہا اور
وہ مادرانہ شفقت سے اس کی نگرانی میں مصروف
رہی۔ چونکہ رابعہ کا شوہر خود بھی تعلیم یافتہ نہ تھا
اس لئے سلیم کی تعلیم باقاعدہ نہ ہو سکی
تاہم وہ معمولی طور پر پڑھتا رہا۔

سلیم نے خیال کیا کہ جب تک میں مجبور
تھا اُس وقت تک بہن کے سہارے زندگی
بسر کرنے میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن اب جبکہ
پیٹ بھرنے کے قابل ہوں میرے لئے ہرگز
جائز نہیں ہے کہ میں اپنا بار دوسروں پر ڈالوں
چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن
ہوگا۔ بہن سے اجازت لیکر میں کسی کے یہاں
ملازمت کرونگا ہر چند مجھ میں کسی کام کی
اہلیت نہیں ہے مگر پھر بھی دو چار روپیہ ماہوار
کی ملازمت ہر جگہ ملجائیگی۔

رابعہ۔ سلیم کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے۔ کیا تمہارے بھائی نے کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے تمہیں یہہ خیال پیدا ہوا میں نے تمہیں بھائیوں کی طرح تمہیں اولاد کی طرح پرورش کیا ہے۔ اور جہاں تک قیافہ سے دوسرے شخص کے دل کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے بھائی کو بھی تم سے وہی محبت ہے جیسی مجھے ہے تم کیا کہتے ہو کہ ملازمت کروں۔ میرے جیتے جی تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے ابھی تمہارے کھیلنے کودنے کے دن ہیں تمہیں نوکری چاکری سے کیا واسطہ۔ کھاؤ پیو اور کھیلو کودو۔

سلیم۔ اس میں شک نہیں بیا۔ کہ آپ نے مجھے بڑی شفقت سے پرورش کیا ہے۔ اور بھائی صاحب نے بھی آج تک مجھ میں اور اپنے بچوں میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ لیکن

اس کے یہہ معنی نہیں کہ میں آپ کی اور اُن کی بزرگانہ عنایتوں کے بھروسہ پر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤں۔ آپ کی شفقت و محبت کا صحیح مصرف آپ کی اولاد ہے اور مجھے ان کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیئے۔ کھیلنا کودنا بے فکری کے مشغلے ہیں۔ میرے واسطے ملازمت ہی بہتر ہے۔

آپا، مجھے بہکانے والا میرا دل ہے جو میرے سینے میں بیٹھا ہوا ہر وقت مجھے بہکاتا رہتا ہے۔ میں حقہ بھر سکتا ہوں۔ پانی پلا سکتا ہوں۔ بچوں کو کھلا سکتا ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ دو چار روپے ماہوار کی نوکری مجھے نہ مل جائے۔

رابعہ۔ توبہ کرو۔ سلیم توبہ! ماں باپ کا نام بدنام نہ کرو۔ خدا نہ کرے جو تم چلمیں بھرو اور لوگوں کے بچے کھلاؤ۔ ایسی باتیں میرے سامنے منہ سے مت نکالو۔

سلیم۔ آپا آپ منہ سے نکالنے کو کہتی ہیں
میں تو اِن کے کرنے کو بھی ہر وقت تیار ہوں
اگر آپ کو شرم آتی ہے تو زیادہ سے زیادہ
آپ کی خاطر میں کہیں باہر چلا جاؤنگا۔

رابعہ۔ کیا مجھے چھوڑ دوگے۔

سلیم۔ نہیں چھوڑ نہیں دونگا بلکہ کچھ
دنوں کے لئے الگ ہو جاؤنگا۔

رابعہ نے بہت چاہا کہ سلیم اپنے اِس
خیال سے باز آجائے مگر اُس نے صاف
کہہ دیا کہ آپ کا جو روپیہ مجھ پر صرف
ہو رہا ہے اس کے مستحق دوسرے لوگ
ہیں۔ آپ صاحب اولاد ہیں اور اولاد کا
سب سے پہلا حق ہے کہ وہ اپنے والدین
کی محبت اور اُن کے سرمایہ سے مستفید ہو۔
سلیم جب گھر سے نکلا تو اُس کے پاس
صرف پانچ روپئے تھے۔ لیکن اطمینان کے
ساتھ اپنی بہن سے رخصت ہوا۔ اور

جب رابعہ نے اُس کے گلے میں باہیں ڈالکر بھرائی آواز میں کہا۔ بیرن بہن کو بھول نہ جانا۔ ماں باپ کی نشانی ہو۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ تو اس نے بہت استقلال کے ساتھ کہا بہن رنجیدہ نہ ہو دعا کرو کہ جس بھائی کو آنسوؤں کی جھڑی میں رخصت کر رہی ہو قہقہوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کرو۔

وہ جے پور سے چل کر سیدھا ٹونک گیا۔ یہاں آکر پہلے تو اُسے سخت وحشت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ سکون ہوتا گیا اور جس طرح ایک بلبل اسیر صحن باغ کو چھوڑ کر قفس تنگ میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتا ہے اسی طرح سرزمین وطن سے نکل کر اُس کا دل سینے میں تڑپا اور تڑپ کر ساکن ہو گیا۔

سلیم ریاست ہفتے تک ٹونک کی گلیوں بازاروں میں گھومتا رہا۔ اتفاق سے

اُس کا کُرتا پھٹ گیا۔ وہ ایک درزی کی دکان پر گیا اور کرتا سینے کی غرض سے اس نے سوئی مانگی درزی نے غور سے سلیم کی شکل وصورت دیکھی اور غریب پردیسی سمجھ کر سوئی دیدی۔ سلیم کُرتا سینے بیٹھ گیا۔ بہت کوشش کے بعد اس نے الٹا سیدھا سی لیا اور ارادہ کیا کہ درزی کے یہاں سے چلا جائے۔ لیکن درزی نے کہا۔ برخوردار تم نے دھاگہ بھی خراب کیا تمہیں سینا نہیں آتا۔ لاؤ کُرتا اُتار دو میں ٹھیک کئے دیتا ہوں سلیم نے کرتا آتار دیا اور درزی نے درست کر کے واپس دیدیا۔

سلیم نے اس تجربہ کے بعد یہہ طے کر لیا کہ انسان کے لئے اس کام سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے درزی سے کہا کہ اگر آپ کا کوئی ہرج نہ ہو تو میں تھوڑی دیر کے لئے آپ کی دکان پر آجایا کروں اور

آپ مجھے کچھ سکھا دیا کریں۔

درزی نے کہا میرا کوئی نقصان نہیں تم شوق سے آیا کرو۔

سلیم اس ہفتے میں بدرالحسن انسپکٹر پولیس کے یہاں چار روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گیا کام صرف یہہ تھا کہ صبح سے شام تک حاضر رہے اور اس درمیان میں جو کام ہو وہ کر دیا کرے

سلیم نے اس کو بہت غنیمت سمجھا۔ وہ صبح چھ بجے سے بارہ بجے تک اور دو بجے سے شام کے چھ بجے تک انسپکٹر صاحب کی ڈیوڑھی پر حاضر رہتا اور فرصت کے اوقات میں بیٹھا ہوا پڑھا کرتا۔ دوپہر کو سینے کی مشق کے لئے درزی کی دکان پر پہنچ جاتا۔

انسپکٹر صاحب نے پڑھنے لکھنے کی طرف سلیم کو اس درجہ ملتفت دیکھ کر اپنے ایک محرر سے کہہ دیا کہ وہ سلیم کو پڑھا دیا کرے اب اس کی تعلیم میں ذرا باقاعدگی پیدا

ہو گئی۔

علاوہ تنخواہ اور کھانے کے سلیم کو کپڑا بھی انسپکٹر صاحب دیا کرتے تھے۔ اگرچہ کپڑے کے متعلق انہوں نے شروع میں وعدہ نہ کیا تھا۔ لیکن انہوں نے سلیم کی دیانت اور محنت سے خوش ہو کر اس کے تمام مصارف اپنے ذمے لے لئے۔

سلیم کی پوری تنخواہ بچ جاتی تھی جس کو وہ اپنی بہن کے پاس بھیجدیا کرتا تھا تین سال تک سلیم انسپکٹر صاحب کے یہاں رہا۔ اور اس عرصہ میں اس نے معمولی حساب کتاب اور نوشت و خواند میں خاصہ ملکہ پیدا کر لیا تھا۔ کپڑے کی قطع و برید اور اس کے سینے پرونے میں بھی اسے کافی مشق ہو گئی تھی۔ سلیم کی عمر بھی اب تقریباً بیس سال کی ہو گئی تھی۔ اور اگرچہ وہ انسپکٹر صاحب سے جدا ہونا نہ چاہتا تھا۔ مگر انسپکٹر صاحب نے اپنے

پاس اس کا رکھنا اس کی حق تلفی پر محمول کیا اور باوجود اس کے مسلسل انکار اور ناراضمندی کے انہوں نے سلیم کو پولیس میں بھرتی کر دیا جہاں دس روپے ماہوار اس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

اب سلیم کو شہر چھوڑ کر "افضل گنج" کے تھانہ میں اپنی ڈیوٹی پر جانا پڑا۔ افضل گنج اگرچہ معمولی قصبہ تھا۔ تاہم ضروریات کی تمام چیزیں وہاں مل جایا کرتی تھیں۔ سلیم سے تھانہ میں صرف تین گھنٹے دن کو اور تین گھنٹے رات کو پہرہ کا کام لیا جاتا تھا۔ ان چھ گھنٹوں کے علاوہ اس کا سارا وقت خالی تھا۔

اس نے دو تین مہینے کی تنخواہ جمع کر کے پچیس تیس روپے کا کپڑا منگا کر کوٹ قمیص اور مختلف قسم کی ضروری اور زیادہ فروخت ہونے والی چیزیں تیار کیں اور پھر بازار میں مناسب جگہ پر ان کی فروخت کا انتظام کیا

پہلی مرتبہ اس کو تیس چالیس روپے کی خالص بچت
ہوئی۔ جس سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور
اس کے دماغ میں ارادوں کی ایک مستقل دنیا
آباد ہو گئی۔ اب اس کا معمول ہو گیا کہ ہر مہینے
تین روپیہ کا کپڑا خریدتا اور کوٹ بنڈیاں وغیرہ
بنا کر بیچ دیا کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے پاس کافی
رقم جمع ہو گئی اور قرب و جوار میں اس کی
دکان خاص طور پر مشہور ہو گئی۔

عہد حاضر کے روشن دماغ مدبرین کہتے
ہیں کہ دوسروں کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھانے
کا نام تجارت ہے۔ لیکن سلیم کا مقولہ تھا کہ
تجارت کہتے ہیں لوگوں کی صحیح ضروریات کے
احساس کو۔

چنانچہ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ
اس وقت عام ذہنیت کیا مانگتی ہے اور
آنکھیں کس چیز کو زیادہ پسند کرتی ہیں پہلے
سادہ کرتے زیادہ مقبول تھے اور قمیص صرف

شہری لوگوں کے لباس میں داخل تھی۔ اس نے ضرورت اور عام مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے عمدہ قسم کی قمیصیں بازار میں مہیا کیں۔ بنڈیوں کی جگہ ویسکوٹ تیار کیے۔ افضل گنج میں کپڑے کی متعدد دکانیں تھیں لیکن کوئی دکاندار ایسا نہ تھا جس کا تعلق براہ راست کسی تجارتی سرگرمی سے ہو۔ سب کے سب ٹونک کے بڑی دکانداروں سے قرض خرید کر گراں قیمت پر فروخت کرنے کے عادی تھے۔ سلیم کی نکتہ رس طبیعت نے اس کمی کو محسوس کر لیا اور اس نے بمبئی کے بازار سے تعلق پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ افضل گنج میں ٹونک کے مقابلے میں بھی ارزاں کپڑا فروخت کرتا تھا۔ اس نے تیار کپڑوں کے علاوہ بزازے کی بھی ایک مستقل دکان قائم کر دی۔

سلیم پانچسال افضل گنج میں رہا۔ اور اس مدت میں اس نے پانچ چھ ہزار کے قریب

سرمایہ جمع کرلیا۔ پانچویں سال کے ختم ہوتے ہی اس کا تبادلہ شہر میں ہوگیا اُس نے اپنا تمام کاروبار ٹونک میں منتقل کرلیا اور وہاں پہنچتے ہی اس نے استعفار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی اس نے سینے کی دو نئی مشینیں خرید کیں اور عمدہ قسم کا کپڑا دکان میں مہیا کیا۔ یہاں آکر اُسے سب سے بڑی دقت یہہ محسوس ہوئی کہ وہ اچھی قسم کے کوٹ پتلون اور شیروانیاں قطع نہ کرسکتا تھا اور یہہ کمی ایسی تھی جو بہت حد تک اس کی ترقیوں میں حائل تھی۔ اب یہ اسے کپڑا خریدنے کی غرض سے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس نے ایک بڑی کمپنی کا پتہ معلوم کرکے اس کے مینجر سے گفتگو کی کہ کتنے عرصے میں اسے جدید وضع کے کپڑے کاٹنے کی تعلیم دی جاسکیگی۔

سلیم کا روپیہ تو بہت صرف ہوا لیکن
چھ مہینے میں وہ کپڑے کی کتربیونت میں نہایت
اچھی مہارت حاصل کرکے بمبئی سے واپس ہوا
سلیم کے پاس سرمایہ کی کمی نہ تھی اور
ملازمت سے وہ مستعفی ہوچکا تھا۔ اس لئے
اب ٹونک میں قیام کرنا اس نے بے سود
خیال کیا۔ ادھر حب وطن نے اس کا دامن
کھینچا۔ چنانچہ پورے آٹھ سال کے بعد اس
نے جے پور کا رخ کیا۔ رابعہ کے شوہر کا انتقال
ہوچکا تھا وہ اپنے دو یتیم بچوں کے ساتھ
گھر میں رہا کرتی تھی اور سلیم جو کچھ بھیجدیا کرتا
تھا اُس سے اپنی گذر کرتی تھی۔

ایک دن شام کو رابعہ کا دروازہ کھلا اور
ایک خوبصورت کشیدہ قامت نوجوان عمدہ
لباس پہنے ہوئے اس کے گھر میں داخل
ہوا۔ رابعہ پہلے چونک کر کھڑی ہوگئی پھر
سلیم کو پہچان کر اُس سے لپٹ گئی۔

سلیم نے ساری رات جاگ کر شروع
سے آخر تک اپنی رام کہانی بہن کو سنائی
اور رابعہ برابر حیرت سے سلیم کا منہ
تکتی رہی۔ حتیٰ کہ سلیم نے یہہ داستان دراز
ختم کرکے بہن سے آئندہ کے لئے مشورہ کیا۔

رابعہ نے دوپٹہ کے آنچل سے بھیگی
آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ سلیم آؤ اپنی امانت
مجھ سے لے لو۔ ڈر ہے میں مرجاؤں اور
یہہ بوجھ میرے سینے پر رہ جائے۔

رابعہ سلیم کو کمرے میں لے گئی اور
ایک جگہ اُس نے زمین پر پاؤں
مار کر کہا۔ سلیم دیکھو۔ یہاں دو فٹ کی گہرائی
پر پیتل کا چھوٹا سا گگرا دفن ہے جس میں
تمہارے مکان کی قیمت اور والدہ مرحومہ
کا زیور رکھا ہوا ہے۔ دو ہزار میں مکان
فروخت ہوا تھا۔ جس میں سے پانچسو روپیہ
میں نے خرچ کرلئے تھے اور تمہارے حصہ کے

ڈیڑھ ہزار اب تک محفوظ ہیں یہہ روپیہ میں
نے تمہاری شادی کے لئے رکھا
تھا۔ یہہ کہہ کر رابعہ ٹھنڈی سانس لے کر
پلنگ پر بیٹھ گئی اس کے ہاتھ پیروں میں لرزہ
آگیا۔ سلیم نے متوحش ہوکر چاروں طرف دیکھا
قریب ہی پانی کا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ سلیم
نے بہن کے منہ پر سرد پانی کے چھینٹے دئیے
تھوڑی دیر کے بعد رابعہ کو ہوش آیا
تو اس نے کہا۔ سلیم میں نے تین وقت
کھانا نہیں کھایا۔ اس وقت ضعف
سے مجھے چکر آگیا تم جو کچھ بھیجتے رہے
اس کا زیادہ حصہ بچوں کی تعلیم پر
صرف کرتی رہی جس قدر بچتا رہتا اس
میں تکلیف اور عسرت کے ساتھ بسر
ہوتی تھی۔
سلیم نے زمین کی طرف اشارہ کرکے
کہا اور یہہ خزانہ کس دن کے لئے رکھا تھا

رابعہ نے پست آواز میں جواب دیا جس دن کے لئے رکھا تھا خدا کی عنایت سے آج وہ دن بھی نصیب ہو گیا۔

سلیم نے جے پور کے سب سے بڑے بازار میں پچاس روپئے ماہوار کی ایک شاندار دکان کرایہ پر لے کر اپنا کارخانہ کھول دیا۔ پہلے دن دس پندرہ ہزار کا کپڑا اس کی دکان میں موجود تھا اور سینے کی چھ بڑی مشینیں کام کر رہی تھیں۔ بارہ کاریگر بحیثیت ملازم اس کے یہاں حاضر تھے۔ جن میں سے چار آدمی سو سے اوپر تنخواہ پاتے تھے۔

رابعہ نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلیم کی شادی کی۔ مگر سلیم کی ہدایت کے موافق کفایت کو ہر قدم پر ملحوظ رکھا۔

سلیم دیانت دار تھا، ذہین تھا۔ اور

حکام سے میل جول پیدا کرنے میں اسے
خاص مہارت تھی۔ اس نے پہلے ہر سال
ریاست جے پور کے عمال پر اپنے اخلاق
دیانت اور رسوخ سے قبضہ کرلیا۔ چھوٹے
ملازم سے لیکر اعلی عہدہ دار تک اس کے
کام' ایفائے عہد' پابندی وقت اور
کاروباری تجربہ کا مداح تھا۔ لیکن سلیم
کے لئے صرف اسی قدر کافی نہ تھا وہ
موقع کا منتظر تھا۔ چنانچہ وقت آنے پر
اس نے سب سے پہلے فوج کی وردی کا
ٹھیکہ لیا۔ اس کے مقابلہ میں دو چار حریف
بھی تھے مگر سلیم نے سب سے کم نرخوں پر
وردی تیار کرنے کا عہدنامہ داخل کر کے
ٹھیکہ لے لیا۔ اس مرتبہ منفعت کے اعتبار
سے تو وہ زیادہ اچھا نہ رہا لیکن سب سے
بڑا فائدہ یہہ ہوا کہ دوسرے محکمہ جات
نے بھی اس کے کام کو پسندیدگی کی نظر سے

دیکھ کر اپنے یہاں کے ٹھیکے اس کو دے
دیے۔ آخر میں مہاراجہ بہادر کے محل خاص
اور درباری ضروریات کا بھی اُسے ٹھیکہ
دیدیا گیا۔ اور گویا وہ تمام ریاست پر چھا گیا
اُسے اپنے کارخانہ کو وسعت دینا پڑی مشینوں
اور کاریگروں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا
دفتر کے لئے چند تجربہ کار آدمی ملازم رکھے گئے۔
اسی درمیان میں سلیم کو اطلاع ملی کہ
اس کے مربی اور محسن بدرالحسن انسپکٹر
کسی قانونی گرفت میں آگئے ہیں وہ فوراً
ٹونک گیا اور انسپکٹر صاحب کے مقدمہ کی
پیروی کے لئے اس نے قابل وکیل
بلائے۔ بالآخر انسپکٹر صاحب کو عدالت نے
چھوڑ دیا۔ لیکن محکمہ نے اُن کو برخاست کر دیا
سلیم انسپکٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے آیا
اور تین سو روپے تنخواہ مقرر کر کے اُن کو
اپنے کارخانے کا منیجر بنا دیا۔

سلیم کی دکان جو اب ریاست جے پور میں
میجونک کمپنی کے نام سے مشہور ہے۔ ریاست
میں سب سے بڑی دکان ہے اور سلیم کو یہ
امتیاز حاصل ہے کہ وہ ریاست میں سب
سے زیادہ "انکم ٹیکس" ادا کرتا ہے۔
اس کی بہن رابعہ دو بچے چھوڑ کر مر گئی
تھی۔ سلیم نے ان دونوں کی تعلیم کا عالی بندوبست
کیا اور اب ان میں سے بڑا لڑکا ولایت سے
ڈاکٹر کی سند لے کر آیا ہے اور چھوٹا ریاست
میں منصفی کے عہدے پر فائز ہے۔
سلیم کے دو لڑکے پیدا ہوئے جس میں
سے ایک تو کم عمری ہی میں ماں کی گود اور
سایۂ پدر سے جدا ہو کر آغوش قبر میں پہنچ گیا
دوسرا جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھ رہا ہے
سلیم جو کسی زمانے میں بدرالحسن انسپکٹر
کی ڈیوڑھی پر گدایانہ عجز و انکسار کے ساتھ
تعمیل احکام کے لئے ہر وقت کمربستہ رہا کرتا تھا

آج دو لاکھ کی کوٹھی میں قیمتی مسہریوں اور خوبصورت صوفوں کے نرم نازک گدوں پر شاہانہ انداز سے پڑا ہوا نیرنگی زمانے کو نگاہ عبرت سے دیکھتا رہتا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ سلیم جو صرف پانچ روپے لے کر گھر سے نکلا تھا کسی زمانے میں ثروت و امارت کی اس قدر بلند سطح پر فائز ہو جائیگا۔ اور کون باور کر سکتا تھا کہ بازار سے ترکاری خرید کر لانے والا معمولی نوکر مستقبل قریب میں اتنے بڑے کارخانے کا مالک بن جائیگا۔ جس میں پچاس ہزار کی خطیر رقم ملازموں کو تنخواہ پر صرف کیجاتی ہے۔ اور کیونکر یقین کیا جاسکتا تھا کہ ایک غریب بہن کا مفلس بھائی جو سرزمین جے پور سے چلمیں بھرنے کی نیت سے روانہ ہوا تھا۔ دولت و اقبال کا تاج زریں پہن کر ارض وطن پر قدم رکھیگا۔

وہ جن کی نگاہیں ظاہری اسباب سے آگے

انسانی کی مختلف حالتیں، انواع اقسام کے
تماشے، رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ
ہیں۔ اس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصہ میں
ہونے والا ہے۔ اور خبریں ہیں اس وقت
کی جب جسد خاکی ان تغیرات سے بے تعلق ہوگا
یہہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں
تو لاجرم اس کا صانع ماننا پڑیگا۔ وہ نیچر ہو
یا خدا۔ مگر اس استادی کے قائل ہیں کہ
باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا۔ اور
کندن بنا کر چھوڑا۔ کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے
میں ڈھالا کہ اس حیات ناپائیدار پر کیسی
ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ
گذریں۔ آفتوں پر آفتیں آئیں۔ مصیبتوں
پر مصیبتیں ٹوٹیں چاہو کہ اس پیرزال کی
نیرنگیوں سے دل اکتا جائے ممکن نہیں۔
اسی منزل گاہ راحت و عیش میں جہاں
باجے گاجے کے غل غپاڑے سے کان پڑی

آوازسنائی نہیں دیتی۔ وہاں شہرت بادہ
ایک کونے میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جس
میں ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں ان خوشیوں
کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں۔ یہہ
مٹی ہوئی صورتیں جو آج اِس سنسان میدان
اور ہو کے عالم میں بے خبر پڑی ہیں۔ کل
اس منزل گاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی
تھیں۔ فارغ البالی کے چتور ان کے سروں پر
سایہ کئے تھے۔ اور حیاتِ مستعار ان پر راحت
اور اطمینان کے پھول برسا رہی تھی۔
عزیزو! تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے ایسا
ہی اُن پر بھی تھا۔ جس طرح تمہارے دلوں
میں ارمان ہیں ان کے دلوں میں بھی تھے
بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ
ہیں اسی طرح ان کے بھی ساتھ تھیں۔ یہی
چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں،
ان کے سروں پر بھی تھے۔ قدرت کی تمام

دلچسپیاں جو ں کی توں ہیں۔ مگر اس کی بہار
دیکھنے والے بدل گئے۔ یہہ نیند کے متوالے
جن کے ڈھیر پیش نظر ہیں اس فراق ابدی
میں خوش نہ تھے، جاگ سکیں تو ان کو اٹھاؤ
اور ان سے پوچھو کس دل سے گئے اور کس
حال میں رہے۔ بڑی طاقتور تھی وہ چیز جو
ان عزیزوں کو ایسی چہل پہل سے اٹھا لائی
اور اس جنگل بیابان میں لا لٹایا۔ فاختہ کی
کوکو نے ان نووارد مہمانوں کو لوری دی
املی اور نیم کی پتیاں ان کو تھپکنے لگیں۔ گویہ
یہہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں ان
کے شکوے شکایات سب ختم ہوئے اور
اب ہمیں ان سے بات کرنے کی بھی فرصت
نہیں۔ مگر نہیں کبھی تو ان کی بھی خاطر منظور
تھی۔ زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت
اٹھایا آؤ آج ان مردوں کی بھی صحبت
میں شریک ہوں ؎

کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے
بڈھے جوان ایک لباس ایک وضع ایک قطع
ننگے سر ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر
فخر کر رہے ہیں۔ بہت سے خلق و محبت کے
بندے ہیں جو اپنی بیش بہا زندگی دوسروں
پر نثار کر گئے گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ
آئے۔ مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے۔
جو کبھی ختم ہونے والے نہیں کیسے مستقل مزاج
لوگ تھے مصیبتیں جھیلیں۔ آفتیں بھگتیں
مفلس جئے۔ قلاش مرے۔ مگر خلوص کے
لہلہاتے پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے
انہیں نہ مرجھانے دیا دیکھو اور نظر غور سے
دیکھو۔ زندگی کا سہرا انہیں کے سر ہے
جیتے جی تو ان کی کچھ وقعت نہیں تھی۔ مگر آج
ان کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں بڑے
بڑے عبادت گذاروں کی ٹکٹکی ان کے
چہروں پر بندھی ہوئی ہے۔ اور یہ آنکھ

اٹھاکر بھی نہیں دیکھتے۔ حاصل عمر دوستوں کی نذر کر دیا۔ عزت کے خواہاں رہے۔ نہ دولت کے طالب، ان کی آرزو، ان کے ارمان، ان کی خواہشیں، ان کی امنگیں، جو کچھ تھیں یہہ تھیں۔ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ خوش نصیب تھے یہہ آپ اور غنیمت تھی ان کی زندگی۔

جنگل بسانے والو گو ہم سے رخصت ہو گئے اور ایسے رخصت ہوئے کہ اب نظر نہ آوگے مگر زیست تھی تو تمہاری، اور انسان تھے تو تم یہہ چوتھی کی دُلہن، یہہ حسین ملکہ، جو آج سنہری کٹھرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اس کے قدر دان کہاں، اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت و شکل کی عورت ہوگی جسکی قبر پر یہہ کچھ نور برس رہا ہے۔ دو رویہ گملوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے جس پر کندہ ہے ملکہ محبت کی آرام گاہ۔

سچ کی پاداش

(ایک امریکن ظریف کے قلم سے)

ایک رات میں نے یہہ عجیب ارادہ کرلیا کہ کل سویرے سے ہرگز جھوٹ نہ بولونگا۔ ہمیشہ بے لاگ سچ بولونگا۔ میں سویرے چاے پی رہا تھا کہ بڑے بھائی صاحب جو مجھے بہت چاہتے تھے عادت کے موافق مسکراتے ہوئے آپہونچے اور کندھے پر ہاتھ رکھہ کر کہنے لگے' گڈ مارننگ۔

رات کتنے بجے لوٹے تھے۔

میں۔ یہی دو بجے کے قریب۔

بھائی۔ دو بجے بڑی دیر کردی۔ اتنی دیر تک کہاں رہے۔

میں۔ دوستوں کے ساتھ تھا۔

بھائی۔ آخر کیا کر رہے تھے۔

میں۔ شراب پی رہا تھا۔

بھائی۔ (غصہ سے آگ بگولا ہوکر) شراب کیا تم بھی شراب پیتے ہو۔

میں۔ ہاں میں بھی پیتا ہوں۔

بھائی۔ (گھونسہ تان کر) اچھا ٹھیرو۔ والدہ کو آجانے دو۔

میں۔ آنے دو مگر میں سچ بولنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔

بھائی صاحب غصہ میں بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے میں بھی باہر جانے کو تیار ہوگیا۔ مگر کیا دیکھتا ہوں کہ بہن نئے کپڑے پہنے دوڑی چلی آرہی ہے کیوں بھیا۔ میں کیسی معلوم پڑتی ہوں ویسی جیسی روز معلوم پڑتی تھیں۔

بہن۔ حیرانی سے) کیا میں اس جوڑے میں زیادہ خوبصورت نہیں دکھائی دیتی۔

میں۔ بالکل نہیں۔

بہن۔ شرمندہ ہوکر۔ تو پہلا ہی جوڑا اچھا

تھا جس کی تم نے بڑی تعریف کی تھی۔

(ناراض ہوکر) تو کیا میں ہر حالت میں بدصورت ہوں۔

میں۔ اس میں کوئی شک ہے۔

یہہ سننا تھا کہ اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا مگر میں نے بالکل پروا نہ کی اور باہر نکل آیا، تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک پرانے دوست کی آواز سنائی دی، اوہو۔ تم آئے، یار میں تم ہی سے ملنے جا رہا تھا۔

میں۔ روکھے پن سے کس لئے۔

دوست۔ بہت دن سے نہیں دیکھا تھا خیر عافیت دریافت کرنی تھی۔

میں۔ اب تو مجھے دیکھ لیا۔

دوست۔ شرمندہ ہوکر ہاں میں دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ تمہاری صحت بہت اچھی ہے۔

میں۔ بڑے روکھے پن سے کچھ اور کہنا ہے

فضول بکواس پسند نہیں کرتا۔

دوست (سٹپٹاکر) ہاں سنو توسہی جیبوں میں تمہاری کچھ ہے۔

میں۔ ہاں کئی چیزیں ہیں۔ رومال۔ نوٹ بک سگریٹ کیس۔

دوست۔ میں روپے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے

میں۔ اسی روپے۔

دوست۔ (چاپلوسی سے ہنسکر) دس روپئے اُدھار دیدو تنخواہ ملنے پر واپس کردونگا۔

میں۔ تم کئی بار دھوکہ دے چکے ہو میں کبھی کوڑی بھی نہ دونگا۔

یہہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور میرا دوست وہیں آگ بگولہ ہوکر کچھ بڑبڑانے لگا۔ اب میں ٹرام گاڑی میں سوار ہوا مگر بیچ میں ایک عورت کا پاؤں کچل گیا۔ میرے خیال میں غلطی اس کی تھی۔ اُسے

چاہیئے تھا کہ پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتی میں نے معافی نہ مانگی، عورت نے گھورتے ہوئے کہا کہ آپ کو معافی مانگنی چاہیئے تھی۔

میں۔ میرا نہیں تمہارا ہی قصور تھا۔

عورت۔ تمہیں عورتوں کا احترام کرنا چاہیئے۔

میں۔ میں چھوڑ عورتوں کا احترام نہیں کر سکتا۔ یہہ سنکر سب مسافر مجھ پر برس پڑے، ٹرام سے اتر کر وہاں ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ ایک اڈیٹر صاحب جو میرے واقف کار تھے۔ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بڑی آؤبھگت کی اور پاس بٹھلا کر کہنے لگے۔ آج کے اخبار میں میرا مضمون دیکھا۔

میں۔ ہاں پڑھ چکا ہوں۔

اڈیٹر۔ کیسا مضمون ہے۔

میں۔ بالکل ہی ردّی۔

اڈیٹر۔ کھانے سے ہاتھ روک کر) اور

غصے سے چلاکر احمق کہیں کا، کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے۔

میں۔ احمق ہی سہی مگر مجھے تو آپ کا مضمون بالکل ردی معلوم پڑا۔

اڈیٹر۔ دانت پیس کر۔ نالائق۔ اخلاق اور شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ میرے سامنے تجھے ایسا کہتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے۔

میں ڈرا کہ کہیں بات نہ بڑھ جائے اور میرے سر پر کوئی برتن نہ ٹوٹ پڑے۔ اسلئے اٹھا اور چپ چاپ گھر لوٹ آیا مگر میں بہت اداس تھا ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک پڑی اور ایک پرانے ملاقاتی اندر گھس آئے۔ اس آدمی کی صورت دیکھتے ہی میرے بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ آج کے واقعہ نے مجھے اتنا چڑچڑا بنا دیا کہ ہمیشہ کی مانند میں نے بناوٹی آؤ بھگت بھی کی۔

ملاقاتی۔ (بیٹھتے ہوئے) میرے آنے سے

کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔
میں۔ ضرور ہوئی۔
ملاقاتی۔ گھبراکر۔ کیا میری موجودگی بری
معلوم ہوتی ہے۔
میں۔ ابھی کیا آگے بھی بری معلوم ہوتی
رہیگی۔
ملاقاتی۔ (بگڑکر) توکیا میں چلا جاؤں۔
میں۔ ضرور چلے جایئے۔
یہہ سنکر وہ ہزاروں باتیں سناتا ہوا چلا گیا۔
اس واقعہ کے بعد گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔
میں باہر نکلا اور ایک ہوٹل میں جا بیٹھا اتفاق
سے وہاں کوئی آفت نہ آئی بہت رات گزرے
میں گھر واپس آیا دبے پاؤں چلتے ہوئے میں
اپنے کمرہ میں پہونچا جلدی سے دروازہ
بند کرکے اپنے کپڑے اُتارنے لگا۔ مجھے فادر
(باپ) کا ڈر لگا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انکا
سامنا ہونے سے پہلے ہی چپ چاپ سو رہوں

ابھی میں یہہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر آہستہ سے آواز آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فادر سامنے کھڑے غصے سے کانپ رہے ہیں بدمعاش لچے اتنی رات تک کہاں تھا۔ میں نے کہا ہوٹل میں بیٹھا تھا۔

فادر۔ شراب کتنی پی۔

میں۔ صرف دو پیالی۔

فادر۔ ہوں صرف دو پیالی۔

یہہ کہتے ہی ان کا طمانچہ میرے گال پر اتنی زور سے بیٹھا کہ سر چکرا گیا۔ پھر تو گھونسوں مکوں تھپڑوں اور ٹھوکروں کی اتنی بارش ہوئی کہ کچومر نکل گیا۔ میں ایسا بدحواس ہوا کہ بول تک نہ سکتا تھا۔ جب فادر ذرا پیٹتے پیٹتے تھک گئے تو یہہ کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے کہ

میرا گھر شرابیوں اور بدمعاشوں کے لئے نہیں ہے۔ کل صبح تجھے راستہ بتلائے دیتا ہوں

میں رات بھر زمین پر نیم بیہوشی کی حالت میں

پڑا رہا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو خود بخود میرے
منہ سے یہہ نعرہ نکل پڑا :-

جھوٹ کی پاداش

اسی وقت میں نے قسم کھالی کہ اب سچ نہ بولونگا
سچ بول کر ایک ہی دن میں یہہ حال ہوا تھا۔
مجھے پختہ یقین ہوگیا کہ دنیا کی بنیاد جھوٹ پر رکھی
گئی ہے۔

(از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم)

صورت گرِ لیلائے سخن ہے قلم اپنا
ہے قوت بازو یہی معنی رقم اپنا
یہہ سخت مراحل ہیں رہا ہم قدم اپنا
اک عمر سے ہمدم ہے یہہ والا ہمم اپنا
اس دوست نے چھوڑا نہ کبھی ساتھ ہمارا
لغزش میں پکڑتا ہے یہی ہاتھ ہمارا
کس عمر سے ہے حامل الفاظ و معانی
باقی ہے یہی اگلے بزرگوں کی نشانی
پیری سے لہو ہوتا ہے جوں جوں مرا پانی
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اسکی جوانی
ہمت کے علاوہ مجھے طاقت بھی سوا دی
بجھنے لگی جب شمع تو لَو اور بڑھا دی

شان اسکی سوا سب سے ہیں انداز نرالے
اکثر یہی لکھ دیتا ہے جنت کے قبالے
ہم راز نہ جس وقت تلک اپنا بنالے
کیا منہ جو زباں سے اِک حرف نکالے
طینت کو جو پوچھو تو عجب نیک ہے اسکی
دہری تو زبانیں ہیں یہہ بات ایک ہے اسکی
سرمایۂ عزت اسی ساتھی کی معیت
سرمایۂ دولت اسی منعم کی بدولت
قائم کیے رکھتا ہے یہی شان شرافت
بے اس کی مدد کے نہیں آتی ہے نجابت
بے بس ہے وہی اس سے جو منہ موڑکے بیٹھا
روئے گا لکھے کو جو اُسے چھوڑکے بیٹھا
تابع اسی ذی قدر کے ہے غرب سے شرق
تیزی ہے یہہ اس میں کہ سرافگندہ ہے برق
یہہ تہ کی خبر لاتا ہے جس وقت ہو غرق
سرکردو قلم بات میں تو بھی نہ ہوا فرق
دنیا میں کسی کارِ نمایاں کو نہ چھوڑے کٹ جائے پہ جیتے ہوئے میدان کو نہ چھوڑے

افکار عالیہ

(از جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم مرحوم)

پیغام کس کا لائی تھی یارب! نسیم صبح
جو گل چمن میں تھا ہمہ تن چشم و گوش تھا

پرتو پڑا جو حسن کا جسم خیال پر
عالم تمام اک سبدِ گل فروش تھا

صبح ازل کی پہلی کرن کا تھا یہ اثر
ہستی کا ذرہ ذرہ تبسم فروش تھا

تاروں کو اس کے تیرے اشاروں نے دی کمک
ورنہ یہہ سازِ ہستیٔ انساں خموش تھا

پہلو میں ہے وہ تیرے جسے ڈھونڈتا ہے تو
منزل میں بیٹھ پاؤں اگر لنگ ہے ترا

ذرا اپنے دل کا کھول کے دیکھ اسکی وسعتیں
دنیا کی اس فضا سے جو دل تنگ ہے تیرا

از راہ طنز کہتے ہیں اہل سخن تسلیم
دہلی و لکھنؤ سے جدا رنگ ہے تیرا

بکس رہی ہیں چمن میں کلیاں لرز رہے ہیں فلک پہ تارے
کسی نے دیکھا نہ تھا ابھی تک یہہ جلوۂ بے نقاب تیرا
نہ میری کشتی کو چھو سکیگا یہہ تیری قہر و غضب کا طوفاں
کہو سمندر کی موج سے تم عبث ہے یہہ اضطراب تیرا
بہشت دیدار کا پتہ دے اگرچہ دوزخ سے ہو گذرنا
رہے مبارک یہہ تجھ کو واعظ! عذاب تیرا ثواب تیرا

میری ہمت کے جو ذرے تھے بکھر کر سمٹے
کیوں نہ ممنون تیری حوصلہ افزائی کا
تتلیاں اڑ گئیں انجام کو پریاں بن کر
شوق فطرت کو ہے از بسکہ خود آرائی کا
جو خموشی میں مزا پایا ہے کیونکر ہو بیاں
ناطقہ بند ہے یارب! میری گویائی کا
ساقی حسن مے جلوہ ذرا روک کے دے

کہ چھلکنے کو ہے ساغر میری بینائی کا
زندہ[1] ریزوں کا جو ہے خون کے قطروں میں ہجوم
اک نمونہ ہے تیری انجمن آرائی کا

کشتیاں قوم کی قسمت کی الٹتی ہیں وہاں
اک تلاطم ہے جہاں عیش کے سامانوں کا
موشگافی ہے نظر میں۔ تو ذرا غور سے دیکھ
ریشۂ نے میں ہے انبوہ نیستانوں کا
میری کشتی گئی گرداب سے بچ بچ کے نکل
دیکھنا ہے ابھی تیور مجھے طوفانوں کا
ملگجا رنگ جو غفلت نے ہی منہ پر پھیرا
یہی دیباچہ ہے ادبار کے افسانوں کا
بزم گردوں میں ستاروں پہ نظر کر غافل
کوئی ساقی بھی ہے نور کے پیمانوں کا
آنچ آئے گی ترے در کے گدا پر نہ کبھی
طنطنہ خاک میں مل جائیگا سلطانوں کا

---

[1] وہ ننھے ننھے کیڑے جو خوردبین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہیں آتے

عشق و انسان میں ہے جو ربط نہ مجھ سے پوچھو
مشت خس پر ہے یہ اک شعلہ کا لرزاں ہونا
حسن بیکار ہو تو ہے آج بھی ممکن غافل
پارۂ سنگ کا پھر لعل بدخشاں ہونا
بعد مردن جو کھلی آنکھ تو معلوم ہوا
ساری بیداری کا اک خواب پریشاں ہونا
قابلیت ہو تو فطرت کو ذرا بخل نہیں
ایک ریشہ سے بھی ممکن ہے نیستاں ہونا

غفلت کی بیخودی یہ کب تک رہیگی اے دل
سو بار گر چکا ہے اک بار تو سنبھل جا
چہرہ پہ مردنی سی چھائی رہیگی کب تک
اٹھ اور زندگی کے سانچے میں اٹھ کے ڈھل جا
دیکھیں تو زندہ کیونکر رہتا نہیں تو اے دل
میری سنے تو ناداں! مرنے ہی پہ مچل جا
ایسی حیات شیریں سب کو نہیں میسر
دنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایک دم نگل جا

ستاروں سے خطاب

از جناب منوہر لال صاحب طالب جلکوانی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

خواب سے تم کو نفرت ہے یا راحت سے تم کو عار ہے؟
نیند سے بیزار ہو یا تم سے وہ بیزار ہے؟
موہنی صورت نے کس کی کردیا ششدر تمہیں؟
دلربا کس مہ لقا کا پرتوِ رخسار ہے؟
صورتِ آئینہ کیوں حیراں ہے چشمِ انتظار
اشتیاقِ دید ہے یا حسرتِ دیدار ہے؟
شوخیٔ حسنِ ازل ہے؟ جلوۂ نورِ خدا؟
ہے چمک اپنی کہ عکسِ نورِ حسنِ یار ہے؟
حسن سے مخمور چشمِ اخترِ شب زندہ دار
کس لئے بیدار مثلِ نرگسِ بیمار ہے؟
کاٹتے ہو رات کیوں آنکھوں میں تم میری طرح
تم پہ بھی کیا چشمِ لطف آہ اشکبار ہے؟
نور کا موجب تمہارا سوزِ دردِ دل نہ ہو؟
سوز کا موجب کہیں حسنِ مہ کامل نہ ہو!!

جگنو

(از ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
حسن قدیم کی یہ پوشیدہ ایک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں تھی ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
پروانہ بھی پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زبا کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی
اک تشت گل میں رکھا احساس کا شرارہ
انساں کو آگہی دی ظلمت کو چاندنی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری
حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا

واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

(از جناب پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ۔ ایم ۔ اے ۔ آئی ۔ سی ۔ ایس)

کوئی تجھ کو جہاں میں کرمک شب تاب کہتا ہے
کوئی تجھ کو جمال گوہر نایاب کہتا ہے
کوئی کہتا ہے تجھ سے نور عرفاں آشکارا ہے
کوئی کہتا ہے تو عرش بریں کا ایک تارا ہے
شب تاریک میں سب کو لبھاتی ہے چمک تیری
دلوں کے واسطے پیغام راحت ہے جھلک تیری
کبھی تو حسن اپنا اہل دنیا کو دکھاتا ہے
کبھی کچھ سوچ کر روئے منور کو چھپاتا ہے
وجود نور میں تیرے ہے سر کن فکاں مضمر
تری ہستی میں ہے واللہ راز دو جہاں مضمر
تری ہستی میں ہے واللہ راز دو جہاں مضمر
چراغ خانۂ تاریک ہے تو بے نواؤں کا
زکوٰۃ نور سے بھرتا ہے تو کاسہ گداؤں کا

کبھی وارفتہ کرتا ہے جہاں کو روئے روشن سے
چھپا لیتا ہے گاہے حسن کو اپنے ہی دامن سے
ترا ممنون منت ہے الم خانہ غریبوں کا
ہوا ظلمت کدہ روشن تجھی سے بدنصیبوں کا
کہاں سے تو نے یہ انداز معشوقانہ سیکھا ہے
کہاں سے اس بلا کا غمزۂ مستانہ سیکھا ہے
اڑائی ہے کہاں سے یہ ادائے [illegible] تو نے
یہ سیکھیں ہیں کہاں سے تازہ اندازِ حسیناں تو نے
مرے جگنو مرے ظلمتکدہ میں نور افشاں ہو
کبھی غمخانہ ناشاد بھی بزم چراغاں ہو

درسِ عمل

(از جناب مولانا تاجور۔ نجیب آبادی)

نہ طواف کعبہ کا عزم کر، نہ جبیں کو نذرِ صنم بنا!
ترا دل ہے دیر و حرم اسی کو حریفِ دیر و حرم بنا!
یہ ہے انتقام ستمگری کہ ستم پذیر نہ بن کبھی
جو مٹے تو پیکر پائمال کو یادگارِ ستم بنا!
تری قوم تیری آبرو، اسی آبرو کو تلاش کر
کبھی "تو" تو سے آپ بھی بن ہی جائیگا پہلے میں کو تو ہم بنا!
ترے دل جام سفال جام جہاں نما ہے ترے لئے
اسے اپنا ساغر جم سمجھ اسے اپنا ساغرِ جم بنا!
مٹے دیر و کعبہ کی کشمکش یہی شیخ کعبہ تو کام کر
کہ صنم کدہ کے پجاریوں کو شریک بزمِ حرم بنا!

(از جناب حضرت آزاد صاحب انصاری)

وہی ایک جلوۂ یار ہے کہیں نور ہے کہیں نار ہے
وہی ایک فصل بہار ہے وہی پھول ہے وہی خار ہے
وہی حال نخوت یار ہے وہی خوئے غفلت کار ہے
وہی رنگ ہے وہی ڈھنگ ہے وہی ننگ ہے وہی عار ہے
وہی تخم کہ خواہش جان و دل وہی بار کہ کاہش جاں گسل
وہی غم ہوا اور وہی جیت ہے وہی میں ہوں اور وہی ہار ہے
وہی ساعت غم دوست ہے وہی غایت غم دوست ہے
وہی حال دل زار ہے نہ شکیب ہے نہ قرار ہے
وہی شور شیون غم فزا وہی آہ و نالۂ جاں گزا
وہی زمزمۂ یار ہے وہی نغمہ ہے وہی تار ہے
جو ذرا سی پی کے بہک گیا جو شیشہ پیا ہی جو چھلک اٹھا
وہ سر دار لائق عار ہے وہ ضرور قابل دار ہے
ہمیں باغ جانے سے فائدہ ہمیں داغ کھانے کی کیا غرض
نہ وہ یار لالہ عذار ہے نہ وہ لطف سیر بہار ہے

(از جناب روشن صاحب صدیقی)

حرم میں محوِ اسرارِ حسن ہو کے رہا
صنم کدہ میں پرستارِ حسن ہو کے رہا
شریکِ جنتِ گلبارِ حسن ہو کے رہا
مگر! کہیں بھی مری روح کو سکوں نہ ملا

مسرتیں بھی رہیں کامرانیاں بھی رہا!
مے نشاط کی گوہر فشانیاں بھی رہیں!
شباب و حسن کی رنگیں کہانیاں بھی رہیں!
مگر! کہیں بھی میری روح کو سکوں نہ ملا

کبھی قیام سرِ آبشار رہتا تھا!
کبھی خرام لبِ جوئبار رہتا تھا!
کبھی بہار میں حسنِ بہار رہتا تھا!
مگر! کہیں بھی میری روح کو سکوں نہ ملا

رہا تسلسلِ پیمانۂ نشاطِ خیال!
کھلا رہا درِ میخانۂ نشاطِ خیال!
رہا ہوں ورخار کاشانۂ نشاطِ خیال!
مگر! کہیں بھی میری روح کو سکوں نہ ملا

فریبِ عقل کی ہشیاریوں میں بھی ڈھونڈا
تخیلات کی بیداریوں میں بھی ڈھونڈا!
تصوّرات کی گل کاریوں میں بھی ڈھونڈا
مگر کہیں بھی میری روح کو سکوں نہ ملا

تعصب

از مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

سہل مت سمجھو تعصب کو بڑی ہے یہ بلا
کر دیا ہے اس نے قوموں اور گھرانوں کو تباہ
حکم ہے اس کا کہ ہے فاقہ تو فاقوں میں مرو
اور جو ذلت ہے تو ذلت پر رہے قانع سدا
حکم ہے اس کا کہ کوئی قوم جس حالت میں ہو
بس وہی اس کی عزت اور شرف کی انتہا
باپ دادا جو گئے ہیں چھوڑیاں رسم و رواج
ناخلف ہے ایک آنچ آ گئے اگر اس سے بڑھا
آدم و حوا نے گر پتوں سے ڈھانکا تھا بدن
نسل میں ان کی وہی پوشش رہے جاری سدا
نوح کی کشتی میں تختے تھے اگر ان گھڑ سے لگے
ہوں جہاز اب بھی اسی کندے کے بیچون وچرا
آدمی کا گھر ہو ایسا ہی پرانی چال کا

لومڑی کے جیسے بھٹ ہے اور بیۓ کا گھونسلا
ایک کا نام آدمی ہو ایک کا ہو جانور
آدمی اور جانور میں ہو نہ فرق اس کے سوا
باپ دادا کے لئے بیٹھے ہو کیا رسم و رواج
وہ گئے اور دم کے ساتھ ان کا زمانہ بھی گیا
دیکھو تم گرتے چلے جاتے ہو پستی کی طرف
آگے آتا ہے گڑھا بعد اس کے ہے تحت الثریٰ
گر کرو زیر ایسے دشمن کو تو ہے مردانگی
جو ابھرنے کی نہیں دیتا تمہیں پروانگی

آفتِ نفاق

از جناب خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

قوم میں جو دیکھیے چھوٹا بڑا
چنتا ہے ڈیڑہ اینٹ کی مسجد جدا
مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ
اپنے پہہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ
سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات
یہہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات
زید کا ہے عمر سے ظاہر ملاپ
دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ
رہتا ہے ایک ایک کے درپے نہاں
جس سے دیکھیے ہے بدگمان
ایک یہہ کہتا ہے کہ میری چلے
دوسرا خواہاں کہ زک اس کو ملے

دیکھے جس کو وہ ہے اس تاک میں

یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں

قوم کی قوم آتی ہے بیکس نظر

جاتی ہیں جاڑوں کی سی سینکس نظر

خودستائی

از جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالیؔ

اے دل بشر وہ کون ہے جو خودستا نہیں
پر خودستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا

جو زیور خرد سے معرا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا

کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دیدیا

کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا

پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ اس لیے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار
اہل وطن کی اپنی بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایک لاکھ جو مانے برا کوئی
ہے عیب صاف کوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی
پر جاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا
دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہہ
اور منہ سے درد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہہ
اک خاکسار کو ہے دیا تم نے یوں بڑھا
قانع ہے وہ انہیں پہ ہوئے وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
کہتا ہے زید۔ عمر ہے شدت سے سادہ لوح

کہتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا بُرا
کہتا ہے عمرو زید و بھی کہتا ہے عیب ہیں
بد ہو کہ نیک ۔ اس کی زباں سے نہیں بچا
سیہ اس کا اور اس کا بیاں کرکے کوئی عیب
ہر اِک ہے اپنی اپنی بُرائی نکالتا
غیبت امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگرچہ خاک کا پتلا نہ خود ستا
حالی جو پیترے کھول ۔ ہے یاں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے ۔ وہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

تصنع

از جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست نہ اس کے ہیں نہ اس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر
کی نہیں جس نے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر
خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوے شر
سنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو
عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر بار دِ حذر

انجام اتفاق

از جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ
لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی چڑھ کر کسی نے گھر لوٹا
کبھی آکر کسی نے زر لوٹا
کبھی اس نے قتل عام کیا
کہیں اس نے ہے آغلام کیا
ملک روندے گئے یاں بیرونی
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

از جناب مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا
ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا
رہنے دو اہل علم ہیں اس طرح
پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
عیدروالوں کا ہے اگر پٹھا
شیخو والوں میں جا نہیں سکتا
شاعروں میں بھی ہے یہی آزار
خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک
دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک

نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے
سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ
ہے ہماری طرف سے وہ گونگا
جن کو ہے کچھ رمل میں معلومات
وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات
کام کندن کا جس کو ہے معلوم
ہے زمانے میں اس کے بخل کی دھوم
غرض جس کے پاس ہے کچھ چیز
جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز
سبھی کمالات اور ہنر ان کے
قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے
ہم پر ان کا کچھ نہیں احساں
ان کا ہونا نہ ہونا ہے ایکساں

دولت اور وقت

از جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں
تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانے میں بڑی بات تری
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے
اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے
لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے

نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آگئی میں جس کے کام
زندہ تاحشر رہا اس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں
اس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خورد و کلاں
پھرتے ہیں وھن میں مری پیر و جواں
گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
کسی آغاز کا انجام نہ ہو
کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا

درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
ہیں رکھائی سے میری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہے اگر شیر تو روباہ کروں
الغرض ہے وہ مری شان عظیم
کرتے آتے ہیں جسے سب تسلیم
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو
تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا
وقت نے سن کے کہا اے دولت
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے گو
اپنی جڑ کی نہیں خبر تجھ کو
تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجئے فرض تجھے گر چشمہ

تو ہوں اس چشمے کا میں سرچشمہ
میں ہوں یا تو ہے اساس امکاں
پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
ہے قرابہ ترا اے عطر آگیں
میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں
ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال میں راس المال
جن کے قبضہ میں ہوں میں اے بیت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت
لاکھ باراں سے اگر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو
اُن کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
طائر رشتہ بپا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود

جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
کھو کے مجھ کو پھر کوئی پاتا نہیں
جا کے میں پھر ہاتھ سے آتا نہیں
ایک پل میری اگر دیجئے گنوا
لیجئے ہاتھ اس سے ہمیشہ اٹھا
تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پر وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
میری ایک ایک پل ہے ان کو عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مرا جاگتے سوتے انہیں پاس
جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں
نہ کوئی کام ہو ان سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی ان کا تمام

نہ انہیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی ان سے پنپا ئے
نہ ادا صوم ہوا ان سے نہ صلواۃ
نہ ہے قدرت میں حج ان کی نہ زکواۃ
نہ مدد ان سے کچھ اپنی کیجائے
نہ خبر ان سے کسی کی لی جائے
گن تو ہیں تجھ میں بہت اے دولت
ہے مگر تنگ مجال فرصت
بس زیادہ نہیں حجت مجھکو
بحث کی اب نہیں طاقت مجھکو
اس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری اک اک آن

از شمس العلماء جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا
"جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا"
دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج
قوم پر قربان ہے جن کا ہر اک چھوٹا بڑا
یہاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد
اپنے اک اک فرد پر قومونکی جانیں ہیں فدا
ملک سارا چھین کر بھی ان کو چین آتا نہیں
اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا
اختلاف دین و مذہب گھل رہا تھا جسمیں زہر
جس نے ملکوں میں دئے تھے خون کے دریا بہا
دم بدم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق
زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا

کر رہا ہے جوش ہمدردی کی صورت میں ظہور
وہ تعصب جس نے باپوں سے کئے بیٹے جدا
دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال
اپنے جب نقصان میں ہو قوم کا ان کی بھلا
وہ ہنلڈن کی جوانمردی سُنی ہو گی کہ جب
ہو گئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اس کے شفا
قوم پر قربان کر دیں اپنی امیدیں تمام
آپ کچھ لینا نہیں چاہا اپنی خدمت کا صلہ
ہے اسی حُب وطن کا اس کے یہ سارا ظہور
ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا
ایک ماماں جس کو دس ملتے ہیں ہفتہ میں شلنگ
جس کے کنبہ کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا
جا کے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتہ کی طلب
قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا
ہے غرض چندہ کی کیا اس سے نہیں کچھ اسکو کام
قوم کا نام آیا اور قابو سے دل باہر ہوا
حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند

خصلتیں یہہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا
ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کرجاتے ہیں کام
پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا
ہے انہیں ہمدردیوں کا ان کو یہہ ثمرہ کہ آج
اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مثل ہوا
لوہا مقناطیس کی جانب ہے کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہے دنیا اس طرح

بچ گناہ سے ورنہ توبہ اور استغفار کر
کھونٹ جس کپڑے میں آئے چارہ کیا بجز از رفو
سنگریزہ تھا فقط گر لعل میں ہوتا نہ رنگ
کوئلے سے تھا بدتر گر مشک میں ہوتی نہ بو
تائب اور معصوم دونوں میں بدیہی فرق ہی
ایک اورزاد طاہر ایک بعد از مشت وشو
گر نہ ہونے کی دماغی قوتیں برباد ہیں
بوستاں سرسبز ہوتا ہی نہیں بے آب وجو

زمانہ موجودہ کی قدردانی

پحر ہستی میں ہوں مثال حباب
مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں
لاکھ نعمت ہے اپنی آزادی
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
ان کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں
دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں
دیکھ کر رنگ کالج و اسکول
اس زمانہ کی قدر کرتا ہوں
مفلسی میں بھی ہے ترقی تمام
مر رہا ہوں مگر ابھرتا ہوں

ترقی مغرب

از جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

اے عزیزو تم بھی ہو آخر بنی نوع بشر
غل ہے کیا نوع بشر میں کچھ تمہیں بھی ہی خبر
کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شان کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہہ غبار ناتواں پہنچا ہے واں
طائر وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہنر

کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج

بڑھ رہا ہے دمبدم یوں آج کل علم بشر

قوت ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور

شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب

کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بدر

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب

عرصہ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر

دوستو شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب

آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی [illegible]

رو ترقی کی چلی آتی ہے [illegible]

آ گئے [illegible] نشاں کرتی [illegible]

دستکاری کو سناتی [illegible] ترقی

علم و حکمت کی [illegible] کرتی [illegible]

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی

غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

ہند میں بھی یا رد آ پہنچا ہے اس رو کا قدم
جو ہیں نا قابل اب اُن کا کھلنے والا ہے بھرم

ہے ترقی پر تنزل بھی اس کے ساتھ ساتھ
یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم

پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست
کر دیا زیر و زبر اس نے جہاں رکھا قدم

گل کھلایا اس نے جو اقصائے مشرقین ابھی
اس کے لکھتے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قدم

چین جو وسعت میں کم اک برِ اعظم سے نہ تھا
اک جزیرے کی لپیٹ نے کر دیا اس کو بھسم

دیکھنا چاہیے نہ ہمچشموں سے رہ جانا کبھی
حق میں ہمسایہ کے ہمسایہ کا بڑھتا ہے قدم

جانتے ہیں سب عزیزو ہے تنزل چیز کیا
اس پہ کر لینا تناعت مل گیا جو بیش و کم

گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا
حق میں لیکن قوم کے یا روہی خصلت ہے سم

قوم [illegible] روق اعظم نے چھٹا کرتا مگر

قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملک جم
جیتے یاں دنیا میں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح
جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم
جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال میں
گذرے جو حالت انہیں بس مگن رہتے ہیں ہم
پر زمانہ کہہ رہا ہے یہہ باواز بلند
یا قدم آگے بڑھاو ورنہ لو راہِ عدم
بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آج کل
وحشیوں کی موت ہے شایستہ قوموں کا عمل

کیوں اس طرح کمر کو گئے تھک کے تھامنے
دیوار باغ وہ نظر آتی ہے سامنے

سرو سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلے چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہیں کیا اسید مبین و یسار تم
میدان عزم جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر بار بار تم

چلّا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
[illegible] اٹھ کے [illegible] آئیں گے

بیٹھو نہ [illegible] عنوان [illegible] چلو

دل کا [illegible] دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطان جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
سب خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو

اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے
کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
اور رخ کو آپ فخر سے رنگ بہار تم
گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو

تارے بھی آسماں پہ ہیں منزل بدل رہے
آب رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
جو ٹھہرے رہے یہاں وہی خرد و بہ جل رہے
بچنے کا یاں مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیاہ سفید کا فیصل حساب ہے

چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتح یاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ نجف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو
نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
اب خاتموں پہ آ گئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبل فتح سے میداں چلے چلو
ہے کنز نائے جنگ کے الحاں چلے چلو

تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ

جنہوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت
نہ جانی مسلط ہوئی ان پہ ذلّت
ملوک اور سلاطیں نے کھوئی حکومت
گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل
نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے
نہ برکت ہے پیشہ میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سوداگروں کے
ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے
کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ ہیں اب دھرے ہاتھ پر ہاتھ بیٹھے

ہنر اور فن داں ہیں سب گھٹتے جاتے
ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے
طبیب اور اُن کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر
نہ ناظم ہیں سرسبز ان کے نہ ناثر
اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں
تو کپڑا وہ ایک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں
تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکینکس کی رو میں تاراج ہیں وہ
نہ پاس ان کے چادر نہ بستر ہے گھر کا
نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا
صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول گلشنو نہیں قلم دفتر و نہیں ⁂ اثاثہ ہے سب عاریت کا گھر و نہیں

جو مغرب سے آئے نہ مال و تجارت
تو مر جائیں بھوکے وہاں اہلِ حرفت
ہو تجار پر بند راہ معیشت
دکانوں میں ڈھونڈھے نہ پائے بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیپاروان سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تجاروان سب
یہہ ہیں ترک تعلیم کی سب سزائیں
وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا راہ عاقبت پھر نہ پائیں
کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سر رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

اپنی تعلیم آپ کرو

بشر کو لازم کہ ہمت نہ ہارے
جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور کم زور سارے
اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو گر آپ ہانکو
بہت خوان بے اشتہا تم نے کھائے
بہت بوجھ بندوں کے تم نے اٹھائے
بہت اس پر ساز کے راگ گائے
بہت عارضی تم نے جلوے دکھائے
بس اب اپنی گردن پہ رکھو جوا تم
کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم
تمہیں اپنی مشکل کو آساں کروگے تمہیں درد کا اپنے درماں کروگے

تمہیں اپنی منزل کا ساماں کروگے
کروگے تمہیں کچھ اگر یاں کروگے
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہو
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے
سراسر ہو گو سلطنت فیض گستر
رعیت کی خود تربیت میں ہو یاور
مگر کوئی حالت نہیں اس سے بدتر
کہ ہر بوجھ ہو قوم کا سلطنت پر
ہو اس طرح ہاتھوں میں اسکے رعیت
کہ قبضے میں غسال کے جیسے میت
وہی گر تجارت کے اس کے سکھائے
وہی صنعت اور حرفت اس کو بتائے
وہی کاشتکاری کے آئیں سکھائے
وہی اس کو لکھوائے وہی پڑھائے
ملا جب رعیت کو ایسا سہارا
کیا ادمیت نے اُس سے کنارہ
یہی سلطنت کی کافی اعانت

کہ ہو ملک میں امن اس کی بدولت
نفوس اور اموال کی ہو حفاظت
حکومت میں ہو اعتدال اور عدالت
نہ توڑا رعیت پہ بیجا ہو کوئی
نہ قانون چھٹ کار فرما ہو کوئی

جہاں ہو یہ انداز فرماں روائی
رعیت کی ہے واں نپٹ بے حیائی
کہ ہر کام میں آس ڈھونڈت پرائی
کرے آپ اپنی نہ مشکل کشائی
کھڑا ہو سہارے اک اڑوار کے گھر
ہٹے وہ جہاں آ رہا یہہ زمیں پر
گیا اب وہ دل تنگیوں کا زمانہ
کہ اپنوں کا حصہ تھا پڑھنا پڑھانا
برہمن کا بیٹا اگر شدر بانا
تو اس پر نہیں کوئی اب تازیانا
ہوئے برطرف سب نشیب و فراز اب
سفید و سیہ میں نہیں امتیاز اب

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
یہی آج کل اصل فرماں وہی ہے
اسی میں چھپا سرِّ شاہنشہی ہے
ملی ہے یہہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہہ ایک شاہ و گدا کو
سکھاتی ہے مخلوق کو یہہ اطاعت
سمجھاتی ہے حاکم کو راہ عدالت
دلوں سے مٹاتی ہے نقش عداوت
جہاں سے اٹھاتی ہے رسم بغاوت
یہی ہے رعیت کو حق دار کرتی
یہی ہر کہ و مہ کو ہموار کرتی
سنی ہے غریبوں کی فریاد اس نے
کیا ہے غلامی کو برباد اس نے
ریپبلک کی ڈالی ہے بنیاد اس نے
بنایا ہے پبلک کو آزاد اس نے
مقید بھی کرتی ہے اور یہہ رہا بھی

بناتی ہے آزاد بھی باوفا بھی
تجارت نے رونق ہے یہہ اسکے آئی
کہ ہیچ اس کے آگے ہے فرماں روائی
فلاحت کی یہہ منزلت ہے بڑھائی
کہ فلاح کرتے ہیں معجز نمائی
ترقی یہہ صنعت کو دی ہے بلا کی
کہ ہوتی ہے معلوم قدرت خدا کی

شرافت محنت

مگر اک فریق اور اُن کے سوا ہے
شرف جن سے نوعِ بشر کا ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور ضیا ہے
سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ محنت طلب وہ
لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ
بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ
وہ تھکتے ہیں تب چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

چنیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایواں
بنیں گر نہ وہ شاہ و کشور ہو عریاں

جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں

یہہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو

سمجھتے ہیں نہیں اس میں جاں اپنی جاں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے انکی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے انکی

مشقت میں عمر ان کی کٹتی ہے ساری
نہیں آتی آرام کی ان کی باری

سدا بھاگ دوڑ ان کی رہتی ہے جاری
نہ آندھی میں عاجز نہ مینہ میں ہیں عاری

نہ لو جیٹھ کی دم تڑاتی ہے ان کا

نہ ٹھہراہ کی جی چھڑاتی ہے ان کا
نہ احباب کے تیغ احساں سے گھائل
نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دکھ درد میں سوئے آرام مائل
نہ دریا و کوہ ان کے رستے میں حائل
سنے ہوں کبھی رستم وسام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام ویسے
کسی کو یہہ دھن ہے کہ جو کچھ کمائیں
کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں
کسی کو یہہ کد ہے کہ جھیلیں بلائیں
یہہ احساں کسی کا نہ ہرگز اٹھائیں
کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں
کوئی چور ہے حب اہل وطن میں
جو مصروف ہے کشت کاری میں کوئی
تو مشغول دوکانداراری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غم گساری میں کوئی
ضعیفوں کی خدمت گزاری میں کوئی

یہہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کنبے پہ ہے جان قربان کرتا

کوئی اس تگ و دو میں رہتا ہے ہر دم
کہ دولت جہاں تک ہو کیجئے فراہم
رہیں جیتے جی تا کہ خود شاد و خرم
مریں جب تو دل پر نہ لے جائیں یہہ غم
کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند و زن کیا
لباس ان کا اور ہوگا اپنا کفن کیا

بہت دل میں رکھتے ہیں اپنے یہہ ارماں
کہ کر جائیں یاں کوئی کار نمایاں
وہ ہوں تا کہ جب چشم عالم سے پنہاں
تو ذکر جمیل ان کا باقی رہے یاں
ہیں طالب شہرت و نام لاکھوں
بناتے ہیں جمہور کے کام لاکھوں

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے

نمائش سے بیزار دشمن ریا کے
ریاضت سب ان کی خدا کے لیٔے ہو
مشقت سب ان کی رضا کے لیٔے ہو
کوئی ان میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں
کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں
کوئی زہد صبر و قناعت پہ مفتوں
کوئی پند و وعظ و جماعت پہ مفتوں
کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا
اسی طرح یاں اہل ہمت ہیں جتنے
کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام ان کے دم کر
فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں اُن کے
بغیر ان کے بے ساز و ساماں تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس
زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے
زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے

ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے
کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہی پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہی سے ہے گر ہے شرف آدمی کو
انھیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت
انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت
انہیں کی ہے سب ربع مسکون میں حرکت
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی
انہیں کا اُجالا ہے ہر رہگزر میں
انہیں کی یہہ ہے روشنی دشت و دریا
انہیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں
انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں
انہیں سے یہہ رتبہ تھا آدم نے پایا
کہ سر اس سے روحانیوں نے جھکایا
ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے

ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے
نجابت ہے ان سے شرافت ہے ان سے
شرف ان سے فخر ان سے عزت ہے ان سے
جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا بھید ذلت میں پنہاں
مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں انہیں کو ہے آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں
بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی
خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ ان کی خبر لی
تو ہو جائیں گے مل کے مٹی میں مٹی
یہہ جوہر ہے ہم میں امانت خدا کی
مبادا امانت ہو ودیعت خدا کی

یہی نوجواں پھرتے آزاد جو ہیں
کمینوں کی صحبت میں برباد جو ہیں
شریفوں کی کہلاتے اولاد جو ہیں
مگر ننگ آباؤ اجداد جو ہیں
اگر نقد فرصت نہ یوں مفت کھوتے
یہی فخر آباؤ اجداد ہوتے

یہی جو کہ پھرتے ہیں بے علم و جاہل
بہت ان میں ہیں جن کے جوہر ہیں قابل
رذائل میں پنہاں ہیں جن کے فضائل
انہیں ناقصوں میں ہیں پوشیدہ کامل
نہ ہوتے اگر مائل لہو و بازی
ہزاروں انہیں میں تھے طوسی و رازی

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں
کہ ہے علم سرمایۂ فخر انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں
رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہہ دعویٰ تھا اک جس پہ محبت نہ تھی کچھ

کھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ
جواہر تھا اک سب کی نظروں میں بھاری
پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری
نہ تھیں طاقتیں اس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ تھا علم میں زور دست الٰہی

رباعیات و قطعات اکبر

خان بہادر میر اکبر حسین صاحب (اکبر الہ آبادی)

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے
اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچہ سخن میں اکبر
نظارہ شاہد معانی کے لئے

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب
اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثل نسیم وہ گلے سے لگ جائے
مانند کلی کے پھول جانا اچھا

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

رشوت سے گلوئے نیک نامی کا چھرا
عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری
گستاخ مگر خوشامدی سے بھی برا

آزادی سے دین کا گرفتار اچھا
شرمندہ ہو دل میں گنہگار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلتِ بد
واللہ بے حیا سے مکار اچھا

ہو علم اگر تجھے تو تسلیم بھی کر
دولت جو ملے اس کو تقسیم بھی کر

اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش
ذلت ہے در اصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈ
محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

بے غیرت و خود فروش و جاہل سے نہ مل
حق سے جو ہو غافل ایسے غافل سے نہ مل
یک جا کر دیں حوادث دہر اگر
جائز ہے کہ ان سے مل مگر دل سے نہ مل

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم
گویا کہ نشیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہو چپ زباں نہیں ہی شمع اخلاص
جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

گھر بار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ
دربار میں باہمی رقابت ہی سہی

ہے ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ بڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھے
عزت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

اس عہد میں یہی ہے بس دانشمندی [illegible]
مذہب [illegible] نکتہ چینی [illegible]
شوقِ عمل نہیں ہے [illegible]
[illegible] بنے ہیں اکثر عابد [illegible]

رکتا نہیں انقلاب چارہ کیا ہے
حیراں ہیں ملک بشر بیچارہ کیا ہے
تسکین کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال
جو کچھ ہے خدا کا ہے ہمارا کیا ہے

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے
رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آکے راز فطرت
سنتے ہی پیام دوست کھل جاتا ہے

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم
لیکن میرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ
اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے
یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

دنیائے دنی محل آفات بھی ہے
فکر روزی مخل اوقات بھی ہے

طرّہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور
جیتا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

انسان میں معتبر لیاقت بھی ہے
محبوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
انداز سخن سے بھی ہے انداز طبیعت
اک جزو قوی مگر شرافت بھی ہے

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے
لذت وہ ہے کہ جو [illegible]
ایماں کا ہو نور دل میں وہ [illegible]
عزت وہ ہے جو [illegible]

آپس میں ہو موافق رہو طاقت [illegible]
کچھ نہ باہم عیب [illegible] تو یہ
صحبت میں [illegible] زی بھی ہو [illegible] نکلیں
دنیا میں بشر [illegible] تو [illegible]

حاسد تجھ پہ اگر حسد کرتا ہے
کر صبر کہ خود وہ کار بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس
اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

انسان جو عمر ختم کرتا ہے
خوہ ہو چکتا ہے آہ بھر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہے رنگ
زندہ جو رہا بھی تو وہ مر چکتا ہے

سنئے حکمت جو میری گفتار میں ہے
ایک حد ادب ہر ایک سرکار میں ہے
پروانے نے شمع سے لپٹنا چاہا
پہلے تھا نور میں اب نار میں ہے

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے
دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے

حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی
اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگ دین
دنیا کی جس کو شرم ہے مرد شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اس کیا کہوں
فطرتاً ہیں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے
اس کے لئے کون سا اسف ہوتا ہے
دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامہ و شور
حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے
بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں نہ ہو ناتوانی نادر
اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

دنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے
بے غیرت و بے دلیل پایا میں نے
اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبرؔ
شدت سے اسے علیل پایا میں نے

افسوس سفید ہو گئے بال ترے
لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے
تو زلف بتاں بنا ہوا ہے اب تک
دنیا پہ ہنوز پڑے ہیں جال ترے

دولت بھی ہے فلسفہ بھی ہے جاہ بھی ہے
لطف حسن بتاں و دلخواہ بھی ہے
سب سے قطع نظر ہے مشکل لیکن
اتنا سمجھے رہو کہ اللہ بھی ہے

اعلیٰ مقصود چاہیے پیش نظر
کوشش تیری گو ہو لطف ذاتی کے لئے

فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا
شیریں کے لئے کہ ناشپاتی کے لئے

مذہب قانون و قوم کا بانی ہے
خالص طاقت عروج روحانی ہے
توہین اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ
یہہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے

آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی ہے
واقف ہوں بنا ئے رتبہ عالی ہے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر
چلتا نہیں کام صرف نقالی ہے

طاقت وہ ہے یا اثر سلطانی ہے
اس جا ہے چمک زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر
اچھی ہے وہ ترتیب جو روحانی ہے

انسان چاہے جو بات وہ اچھی چاہے
بدیوں سے محترز ہونے کی چاہے
شیطان سے وہ خلاقی ہے منسوب
جس کا مطلب ہے کہ وہ جو جی چاہے

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر
بڑی مایوسیوں کے بعد اکثر کام چلتا ہے
یہہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اس کا عاشق صادق
مگر کبھی ہے خلقت شمع سے پروانہ جلتا ہے

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے
دنیا کے بھی ہو لیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہہ نور صبح پایا نہ ہوا
پھر کیا تم جو عرش کے تارے بھی ہوئے

غفلت

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے
جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

وفاداری

میں نے کہا کیوں لاش یہ آقا کی ہے مرتا
ہوٹل کی طرف جا کہ غذا بھی ہے کوئی چیز
کتے نے کہا ہو یہ جہالت کہ تعصب
لیکن مرے نزدیک وفا بھی ہے کوئی چیز

نیک و بد کی شناخت

آئینہ خانے میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال
تا تجھے جانیں کہ یہ صاحب نظر اچھا ہوا
ہے برا تو ہی نظر آیا برا تجھ کو اگر
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

اطلاع

ساکن سعید منزل قریب درگاہ حضرت اجالے شاہ صاحبؒ
بلدہ حیدرآباد دکن